

# ہماری تاریخ

(ہم نے جب روایات (احادیث) کے متعلق لکھا کہ وہ کس طرح جمع اور مرتب کی گئیں اور دینی کا ذریعہ علم ہونے کی جہت سے وہ کس قدر غیر یقینی اور طتی ہیں، تو بعض احباب نے ہمیں لکھا کہ صدر اقل (عہد نبی اکرمؐ اور خلافت راشدہ) میں اسلامی نظام عمل قائم ہوا تھا، اس لئے اس دور کی تاریخ تو یقینی ذریعہ علم ہو سکتی ہے۔ اس میں اس نظام کی عملی تفصیل معلوم ہو سکتی ہیں۔ ان سے کیوں نہ راہ نمائی حاصل کی جائے۔ اس سے یہ حقیقت سامنے آئے کہ جس طرح ہماری قوم کے دانشوروں نے حدیث سے متعلق طریقہ کا مطالعہ نہیں کیا، اسی طرح انہیں ہماری تاریخ کے متعلق بھی صحیح معلومات حاصل نہیں۔ ذیل کے مقالہ سے یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ ہماری تاریخ، اسلام کے صدر اقل کا کس قسم کا نقشہ پیش کرتی ہے۔ واضح رہے کہ جس طرح احادیث میں جامعہ امام بخاریؒ کو اولیت حاصل ہے اسی طرح تاریخ میں اولیت امام ابن جریر طبریؒ کو حاصل ہے۔ اس مقالہ کے مندرجات اکثر و بیشتر بخاری اور طبری پر مشتمل ہیں۔ ان کا غور سے مطالعہ فرمائیے۔)

(۱)

تاریخ بھی عجیب دو دھاری تلوار ہے۔ اگر کسی قوم کے پاس اس کی صحیح تاریخ موجود ہے تو وہ قوم اپنے ماضی کے تجربات کے آئینہ میں اپنے حال کو درخشاں اور مستقبل کو تابندہ بنا سکتی ہے۔ لیکن اگر اس کی تاریخ غلط ہے تو وہ غلط فہمیوں اور خوش عقیدتوں کی ایسی اندوہناک تاریکیوں میں گھری رہتی ہے جن سے اس کا نکلنا محال ہو جاتا ہے۔ ہمارے ساتھ یہی ہوا ہے۔ ہمارے زوال کے اسباب میں بنیادی عنصر ہماری غلط تاریخ ہے۔

ہمارے پاس خدا کی کتاب ہے جس کے متعلق ہمارا ایمان ہے اور علی وجہ البصیرت اور مبنی علی الحقیقت ایمان) کہ وہ ایک ایسا رابطہ حیات ہے جو زندگی کے ہر گوشے اور ہر زمانے میں ہماری صحیح راہ نمائی کرنے کے لئے مکمل اور کافی ہے۔ اگر ہم اس کا اتباع کریں تو ہمیں اقوام عالم کی امامت مل سکتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ قرآن کی راہ نمائی ہمارے لئے اسی صورت میں قطع بخش ہو سکتی ہے جب ہم اسے سمجھیں لیکن قرآن کو صحیح طور پر سمجھنے کے راستہ میں سب سے بڑی رکاوٹ

**قرآن فہمی کے راستہ میں روک**

اور حیرت خیز ہو۔ لیکن جب حقائق آپ کے سامنے آئیں گے تو آپ اس کی صداقت کو بلا تامل تسلیم

کر نہیں گئے۔ قبل اس کے کہ ہم اس کی کچھ مثالیں آپ کے سامنے پیش کریں، تمہیداً یہ بتا دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ تاریخ کس طرح قرآن کا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ مثلاً قرآن کریم جس معاشرہ کی تشکیل کرتا ہے۔ اس کے افراد (جماعت مومنین) کی خصوصیات میں یہ بھی بتاتا ہے کہ **يُخَفِّقُونَ** (پہ) جو کچھ انہیں خدا کی طرف سے سامانِ زیست ملتا ہے وہ اسے نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کے لئے کھلا رکھتے ہیں۔ دوسرے مقام پر اس کھلا رکھنے یا دوسروں کو دے دینے کی نصیحت ان الفاظ سے کر دی کہ **كَيْسَلْتُمْ نَفْسَكُمْ مَا ذَا يُخَفِّقُونَ**..... (پہ) اے رسول! جماعت مومنین کے افراد تمہارے دریافت کرتے ہیں کہ ہم اپنے مال و دولت میں سے کس قدر دوسروں کو دیں؟ جواب میں کہا گیا۔ **قُلِ الْخَفْوُ**..... (پہ) ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری ضرورت سے زائد ہے سب کا سب۔ ان آیات سے واضح ہے کہ قرآنی معاشرہ میں افراد معاشرہ اپنی محنت کی کمائی میں سے صرف اسی قدر اپنے پاس رکھ سکتے ہیں جو ان کی ضروریات کو پورا کر سکے۔ اس سے زائد قرآنی نظام (یا اسلامی مملکت) میں چلا جائے گا جو اسے نوعِ انسان کی ربوبیت (پرورش) کے لئے صرف کرے گا۔ ان آیات کا مفہوم سمجھنے میں نہ کوئی دقت پیش آتی ہے نہ دشواری۔ نہ ان میں کوئی اشکال ہے نہ اغلاق۔ لیکن آپ جب یہ آیات کسی کے سامنے پیش کریں تو وہ جواب میں کہہ دیتا ہے کہ فلاں صحابیؓ کے پاس لاکھوں درہم و دینار تھے۔ فلاں کے پاس چاندی اور سونے کے ڈھیر لگے رہتے تھے۔ فلاں کے پاس کارواں درکارواں سامانِ تجارت رہتا تھا۔ اگر کوئی شخص ضرورت سے زائد دولت اپنے پاس رکھ سکتا تو ان حضرات کے پاس اس قدر دولت کیوں جمع رہتی تھی؟ اس کے بعد سلسلہ و کلام کچھ اس انداز کا ہوتا ہے۔

وہ صاحب: فرمائیے! صحابیہ کبار قرآن کو صحیح طور پر سمجھتے تھے یا آپ بہتر سمجھتے ہیں؟  
آپ:۔ میں تو کبھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں صحابہ کبارؓ سے زیادہ قرآن سمجھتا ہوں۔

وہ صاحب: کیا صحابہ کبارؓ قرآن کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے یا ان کا عمل اس کے خلاف تھا؟  
آپ:۔ معاذ اللہ! میں کیسے کہہ سکتا ہوں کہ ان کا عمل قرآن کے خلاف تھا۔ ان کی زندگی بالکل قرآن کے مطابق تھی۔

وہ صاحب:۔ جب ان کی زندگی قرآن کے مطابق تھی۔ اور ان کے پاس اس قدر مال و دولت جمع رہتا تھا تو پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ قرآن کی رو سے زائد از ضرورت مال، افراد کے پاس نہیں رہ سکتا۔

اس منطق کا آپ کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا۔ سننے والے بھی فریقِ مقابل کے ساتھ متفق ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک سر ہلا کر کہہ دیتا ہے کہ بات بالکل ٹھیک ہے۔ جب صحابہ کبارؓ کے پاس اس قدر مال دولت تھا تو پھر یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ اسلام میں دولت جمع کرنا ممنوع ہے؟ کیا (معاذ اللہ) صحابہؓ کو اتنا قرآن بھی نہیں آتا تھا؟

آپ نے دیکھا کہ تاریخ کس طرح قرآن کے راستے میں آکر کھڑی ہو گئی؛ آپ یہ معلوم کر کے حیران ہوں گے کہ ہمارا مروجہ اسلام تاریخ کا مرتب کردہ ہے اور اس کا بیشتر حصہ قرآن کے خلاف ہے۔ مروجہ اسلام کی کسی شق کے متعلق آپ سند مانگئے۔ وہ سند تاریخ سے پیش جائے گی۔ اگر آپ کہیں کہ اس کی سند قرآن سے پیش کیجئے تو جواب میں کہہ دیا جائے گا کہ

## نازک دلیل

ہم رسول اللہ کی سیرت طیبہ اور صحابہ کبارؓ کی زندگی سے اس کی سند پیش کر رہے ہیں۔ اس سے بڑھ کر دین میں سند اور کیا ہو سکتی ہے؟ قرآن کے سمجھنے کے لئے سیرت رسول اللہ اور صحابہ کبارؓ کی حیات مقدسہ کا سامنے رکھنا لایفک ہے۔ اس کے بغیر قرآن سمجھ میں نہیں آسکتا۔

یہ جواب اس قدر مسکت ہے کہ اس کے بعد آپ کچھ کہہ ہی نہیں سکتے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ تاریخ، دین کی سند بن گئی ہے اور قرآن کریم ایصالِ ثواب کے لئے رہ گیا ہے۔ اگر کبھی ایسا ہو کہ تاریخ کے کسی واقعہ کی تائید قرآن کی آیت سے مل جائے تو اس وقت قرآن کو بڑھا چڑھا کر پیش کر دیا جاتا ہے۔ لیکن جب تاریخ اور قرآن میں تضاد ہو تو سند تاریخ کو مائل ہو کر قرآن کو نہیں۔

جب تک ہم قرآن اور تاریخ کی صحیح صحیح پوزیشن کو نہیں سمجھتے اور انہیں اپنے اپنے مقام پر نہیں رکھتے، دین اپنی حقیقی شکل میں ہمارے سامنے نہیں آسکتا۔

## تاریخ کی صحیح پوزیشن

قرآن کا ایک ایک لفظ اپنی اصل شکل میں ہمارے پاس محفوظ ہے۔ اس میں شبہ اور شک کی کوئی گنجائش نہیں۔ جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے (خواہ وہ کتب احادیث میں ہو اور خواہ کتب سیر و آثار میں) اس کی پوزیشن یہ ہے کہ ان میں سے کوئی کتاب نہ رسول اللہ نے مدون کر آ کر اُمت کو دی نہ خلفائے راشدین نے انہیں مرتب کیا۔ نہ ہی ان میں سے کوئی کتاب صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانے میں مرتب ہوئی۔ حدیث کا وہ مجموعہ جسے ائمہ الکاتب بعد کتاب اللہ کہا جاتا ہے۔ (یعنی بخاری شریف) وہ رسول اللہ کی وفات کے قریب اڑھائی سو سال بعد مرتب ہوا۔ اور تاریخ کی سب سے پہلی جامع کتاب جسے ام التواریخ کہا جاتا ہے (یعنی تاریخ طبری) رسول اللہ کی وفات کے قریب تین سو سال بعد لکھی گئی۔ اس وقت بھی کوئی تحریری ریکارڈ موجود نہیں تھا جس سے ان کتب احادیث و تاریخ کو مرتب کیا گیا ہو۔ یہ یکسر ان باتوں پر مشتمل تھیں جو انہوں نے اپنے ہم عصرین کی زبانی سُنیں۔ یہ ہے ہماری تاریخ کی اولیں کتابوں کی پوزیشن جن سے سیرت رسول اللہ اور صحابہ کبارؓ کی زندگی سامنے آتی ہے۔ (واضح رہے کہ نبی اکرمؐ کی سیرت طیبہ کا بیشتر حصہ اور صحابہ کبارؓ کی خصوصیات کبریٰ خود قرآن کریم میں بھی مذکور ہیں۔ لیکن اس وقت ہم سیرت و آثار کے اس حصے کے متعلق گفتگو کر رہے ہیں جو کتب احادیث و سیر وغیرہ میں موجود ہے)۔

قرآن اور تاریخ کی جو پوزیشن اور بیان کی گئی ہے۔ اس سے ہر صاحب بصیرت اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ جب بھی قرآن کے کسی بیان اور عہد محمدؐ رسول اللہ و الذین معہ کی تاریخ کے کسی واقعہ میں تضاد نظر آئے تو قرآن کے بیان کو صحیح اور تاریخ کے واقعہ کو غلط قرار دینا چاہیے۔ یہ ایک ایسی حقیقتِ باہرہ ہے جس کے لئے



**قرآن اور تاریخ کا باہمی تعلق** | کسی دلیل و شہادت کی ضرورت نہیں۔ یہ اپنی دلیل آپ ہے۔ اب وہی تاریخ کے وہ بیانات جن کے متعلق قرآن خاموش ہے تو ایسی صورت میں بھی ہمارے لئے اصول کار واضح ہے۔ یعنی:-

(۱) ہمارا ایمان ہے (اور قرآن اس کی شہادت دیتا ہے) کہ نبی اکرمؐ اور صحابہ کبارؓ کی زندگی قرآن کی تعلیم کے مطابق تھی۔

(۲) لہذا اگر تاریخ میں نبی اکرمؐ یا صحابہ کبارؓ کے متعلق کوئی ایسی بات ملتی ہے جو قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے تو ہمیں بلا تامل کہہ دینا چاہیے کہ تاریخ کا وہ بیان صحیح نہیں۔

اس طرح دین کا صحیح تصور بھی قائم ہو جائے گا اور نبی اکرمؐ اور صحابہ کبارؓ کی سیرت پاکیزہ اور حقیقی شکل میں ہمارے سامنے آ جائے گی۔

جو کچھ ہم نے (نظری طور پر) اوپر کہا ہے وہ واضح انداز میں سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ جب تک تاریخ سے اس کی کوئی مثال پیش کی جائے۔ ہم عہد محمد رسول اللہ والذین معہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین) کی تاریخ سے اس قسم کی بہت سی مثالیں پیش کر سکتے ہیں۔ لیکن چونکہ اس مقالہ

## ایک مثال

میں اس کی گنجائش نہیں (اس کے لئے ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہے)

اس لئے ہم اس ضمن میں صرف ایک واقعہ پیش کرنا کافی سمجھتے ہیں۔ یہ وہ واقعہ ہے جو اس وقت پیش آیا جب نبی اکرمؐ نے سفر آخرت اختیار فرمایا۔ اور ہنوز آپؐ کے جسد طیب کو سپرد خاک بھی نہیں کیا گیا۔ اور اس کا تعلق صحابہ کبارؓ کی اس پوری جماعت سے ہے جو اس وقت مدینہ میں موجود تھی۔

پہلے اس سلسلہ میں قرآن کی تعلیم کو سامنے لائیے۔ قرآن کی بنیادی اور عزیز متبدل اصول یہ

## قرآن کے غیر متبدل اصول

ہے کہ وَلَقَدْ كَتَبْنَا مِثْقَلًا ذَرًّا (۱)۔ (یٰۤاٰیہا) ہم نے ہر انسانی بچہ کو، محض اس کے انسان ہونے کی جہت سے واجب الشکریم پیدا کیا ہے۔ یعنی اس میں حسب نسب، امیر، عزیز، راجا اور وطن، مذہب و ملت کی کوئی تفریق نہیں۔

(۲) واجب الشکریم ہر انسانی بچہ ہے۔ اب رہ مختلف افراد کے مدارج کا تعین، سو اس کے لئے

اصول یہ ہے کہ وَلَقَدْ كَتَبْنَا مِثْقَلًا ذَرًّا (۲)۔ ہر ایک کا درجہ اس کے کاموں کے مطابق متعین کیا جائے گا۔ بالفاظ دیگر مدارج کا تعین، جو سرفرازی اور اعمال کی بنا پر ہو گا۔ اس میں بھی خاندان، قبیلہ، ذات، گوت، رشتہ داری، امارت، غرضیکہ کسی انصافی نسبت کا کوئی دخل نہیں ہو گا۔

(۳) اسی اصول کے مطابق، امت میں سب سے زیادہ واجب الشکریم وہ ہو گا جو قرآن میں خداوندی کا سب سے زیادہ پابند ہو گا۔ جس کی سیرت و کردار سب سے زیادہ قرآن کے مطابق ہوں گے۔ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (۳)۔

ان عزیز متبدل اصولوں کی روشنی سے قرآن نے راجا، نسل، خون، قبیلہ، ذات و عزیزہ کے تمام امتیازات

ختم کر دیئے۔ اور عزت دیکر ہم کا صرف ایک معیار باقی رکھا۔ یعنی جو بہر خدائی اور حسن سیرت و کردار۔  
**امت کا فریضہ** | اب آگے بڑھئے۔ نبی اکرمؐ نے قرآنی اصولوں کے مطابق ایک معاشرہ متشکل فرمایا۔ ایک مملکت قائم کی۔ جس کا مقصد "امر بالمعروف ونہی عن المنکر" تھا۔  
 چونکہ اس نظام کو نبی اکرمؐ کی زندگی تک ہی نہیں رہنا تھا۔ اسے مسلسل آگے چلنا تھا کیونکہ اسی کا نام دین تھا۔ اس لئے اس مقصد کے لئے ایک امت تیار کی گئی۔ اس امت کے متعلق قرآن میں ہے: **كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ**..... (۲۴۱) تم بہترین امت ہو جسے نوع انسان کی مہبود کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ تمہارا فریضہ حیات امر بالمعروف ونہی عن المنکر ہے۔ یہی وہ امت تھی جسے وراثت کتاب کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔ قرآن میں ہے: **ثُمَّ أَوْزَعْنَا الْكِتَابَ الْكَذِبَينَ أَصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا**..... (۲۴۲) پھر ہم نے ان لوگوں کو اس کتاب کا وارث بنایا جنہیں اس مقصد جلیل کے لئے اپنے بندوں میں سے چنا تھا۔ یہ امت (اس زمانے میں) ہاجرین اور انصاریہ پر مشتمل تھی جس کے بچے اور سچے ہونے کا سرٹیفکیٹ خود اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا تھا۔ سورہ انفال میں ہے:-

**وَالَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَمُوجُوا أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ** (۲۴۳)

اور جو ایمان لائے۔ اور انہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ اور جنہوں نے (انہیں) پناہ دی اور ان کی مدد کی۔ یہ سب سچے اور سچے حقیقی مومن ہیں۔ ان کے لئے ہر قسم کی حفاظت اور عزت کا رزق ہے۔

دوسرے مقام پر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں ایک دوسرے کی الفت ڈال دی تھی۔ اور یہ وہ نعمت کبریٰ تھی جو ساری دنیا کی دولت خرچ کرنے پر بھی نہیں مل سکتی تھی (۲۴۴) سورہ توبہ میں ان کے متعلق ہے: **أُولَٰئِكَ لَهُمُ الْخَيْرَاتُ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ** (۲۴۵) یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے ہر قسم کی بھلائیاں ہیں اور یہی ہیں جو کامیاب و کامرانی ہیں۔ سورہ فتح میں خاتون کائنات نے ان بچے اور سچے مومنین کی جس والہانہ انداز میں توصیف و تعریف کی ہے وہ ان حضرات کی بلند کی مقام کی زندہ شہادت ہے۔ دیکھئے! کہنے والے نے کس طرح جھوم جھوم کر کہا ہے:-

**مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكْعًا مَّسْجِدًا يَسْتَعِذُّونَ فَضْلًا مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا مِنْ سَيِّئَاتِهِمْ فِي وَجُوهِهِمْ مِّنْ أَثَرِ الشُّجُورِ ذَٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي الشُّرَّةِ وَمَثَلُهمْ فِي الْإِنجِيلِ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْطًا فَزَازَهُ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوَىٰ عَلَىٰ سَوَافِهِ يُغِيبُ السَّيَّاتُ لِيُخَيِّطَ بِهِمْ أَلَا يَلْقَاوُا عِندَ اللَّهِ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا**

الصَّالِحَاتِ مِنْهُمْ مَغْفُورَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا (۱۸)

اس آیت جلیلہ کا مفہوم یہ ہے۔

محمد رسول اللہ اور ان کے رفقاء کی جماعت بھی کیا عجیب جماعت ہے۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ مخالفین کے مقابلہ میں چٹان کی طرح سخت ہیں اور آپس میں بڑے نرم دل اور بہرہ نوا نہیں دیکھنا ہے کہ وہ کس طرح ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کے لئے جھک جاتے اور قوانین خداوندی کے سامنے پکیر تسلیم و رضا میں جاتے ہیں۔ لیکن وہ راہبوں کی جماعت نہیں وہ خدا کے قانون کے مطابق سامانِ زیست کی طلب و جستجو میں بھی مصروفِ عمل رہتے اور زندگی کے ہر معاملہ میں قوانینِ الہیہ سے ہم رنگ و ہم آہنگ رہتے ہوئے اپنے اندر صفاتِ خداوندی منعکس کرتے ہیں۔ ان کے اندر صفاتِ خداوندی کی نمود سے سکون و طمانیت کی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اس کے آثار ان کے چہروں سے نمایاں ہوتے ہیں۔ ان کے یہ خصائصِ قویات میں بھی مذکور تھے اور انجیل میں بھی۔

انہوں نے جس طرح بتدریج اس نظامِ خداوندی کو قائم کیا ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھو۔ عمدہ بیج سے شکوفہ نکلتا ہے تو پہلی کو پل بڑی نرم و نازک ہوتی ہے۔ پھر وہ مضبوط ہوتی چل جاتی ہے۔ پھر جب اس کے خوشوں میں دانے پڑنے کا وقت آتا ہے تو وہ خود اپنی نالوں پر محکم اور استوار طریق سے کھڑی ہو جاتی ہے۔ کاشتکار جب اپنی محنت کو یوں ثمر بار ہوتے دیکھتا ہے تو وجد و مسرت سے جھوم اٹھتا ہے۔ لیکن یہی چیز اس کے دشمنوں کے سینے پر سانپ بن کر لوٹنے کا موجب بن جاتی ہے۔

اس طرح اللہ ہر اس جماعت سے جو اس کے نظام کے ان دیکھے نتائج پر یقین رکھ کر صالحہ بخش پروردگار پر عمل پیرا ہو، اس کا وعدہ کرتا ہے کہ ان کی کوششوں کا نفع سا بیج تمام خطرات سے محفوظ رہے گا۔ اور ان کی کھیتی بہترین ثمرات کی حامل ہوگی۔

یہ تھی وہ جماعت، جس نے رسول اللہ کے مقدس لمحوںِ تربیت، پائی تھی اور جس نے حضور کے بد قرآنی نظام کو آگے چلانا تھا۔ اس مقصد کے لئے ان سے کہہ دیا گیا تھا کہ **وَأْمُرْهُمْ شَوْحِي بَيْنَهُمْ**..... (۲۲) وہ اپنے معاملات باہمی مشورہ سے طے کریں۔

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ

(۱) قرآنِ کریم کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ عزت و تکریم کا معیار ذاتی جوہر اور حسنِ عمل ہے۔ نہ کہ حسبِ نسب اور رشتہ داری کے تعلقات۔

(۲) صحابہ کبارؓ پختے اور سچے مومن تھے۔ ان کی سیرت بہت بلند اور کردار بڑا پاکیزہ تھا۔ ان کے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت پرست تھی۔

(۳) قرآنی نظام کو قائم رکھنا اور آگے چلانا امت کا اجتماعی فریضہ ہے۔ اس کے لئے وہ باہمی مشورہ سے



اپنے میں سے بہترین فرد کو (جو معاہدہ خداوندی پر پورا اترے) منتخب کر کے، رسول کا جانشین، یعنی مملکت کا سربراہ، بنائیں گے۔ اسے خلافت علی منہاج رسالت کہتے ہیں۔

امت کے لئے قرآن کے ان اصولوں پر عمل کرنے کا پہلا موقعہ، رسول اللہ کی وفات کے فوری بعد پیدا ہو گیا۔ یعنی خلیفہ کا انتخاب۔

یہ تھی قرآن کریم کی تعلیم اور قرآن کی رو سے صحابہ کبارؓ اور جماعت، انصار و مہاجرین کی خصوصیات کبریٰ۔ اب دیکھئے کہ تاریخ اس باب میں کیا کہتی ہے۔

(۶)

## خلافت کے متعلق حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ کے خیالات

بخاری (باب وفات النبیؐ) میں  
حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ کی

روایت سے حسب ذیل واقعہ بیان کیا گیا ہے۔

اس بیماری میں جس میں آپؐ نے وفات فرمائی، علی ابن طالبؓ رسول اللہ صلعم کے پاس باہر آئے تو لوگوں نے ان سے پوچھا۔ ابو الحسن! رسول اللہ صلعم نے کس حالت میں صبح فرمائی؟ حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ الحمد للہ اچھی حالت میں صبح فرمائی ہے۔ تو عباسؓ نے عبد المطلبؓ ان کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف کولے گئے اور ان سے کہنے لگے۔ خدا کی قسم میں دن کے بعد تم لاشی کے غلام ہو گئے بھلا میرا یہ خیال ہے کہ رسول اللہ صلعم کا اپنی اس بیماری میں انتقال ہو جائے گا۔ میں خوب پہچانتا ہوں کہ عبد المطلبؓ کی اولاد کے چہرے مرتے وقت کیسے ہوتے ہیں۔ چلو رسول اللہ صلعم کے پاس چلیں اور آپؐ سے دریافت کریں کہ آپؐ کے بعد حکومت کن لوگوں میں ہوگی۔ اگر ہم میں ہوئی تو ہمیں معلوم ہو جائے گا۔ اور اگر ہمارے سوا دوسروں میں ہوئی تو بھی ہمیں معلوم ہو جائے گا اور آپؐ اپنے جانشین کو ہمارے حق میں وصیت فرمائیں گے اور اس پر حضرت علیؓ نے فرمایا کہ کیا اس امر کی طمع ہمارے سوا کسی دوسرے کو بھی ہو سکتی ہے؟ عباسؓ نے فرمایا کہ میرا خیال ہے کہ خدا کی قسم ایسا ضرور ہوگا! اس پر علیؓ نے کہا کہ خدا کی قسم اس بارہ میں اگر ہم نے رسول اللہ صلعم سے پوچھ لیا اور آپؐ نے انکار کر دیا تو آپؐ کے بعد لوگ میرے حکومت کبھی بھی نہیں دیں گے۔ خدا کی قسم میں اس بات کو رسول اللہ صلعم سے ہرگز نہیں پوچھوں گا۔ (صحیح بخاری۔ باب وفات النبیؐ)

اس روایت سے ظاہر ہے کہ ابھی حضورؐ کا انتقال بھی نہیں ہوا تھا کہ حضورؐ کے چچا حضرت عباسؓ اور چچا زاد بھائی اور داماد حضرت علیؓ کے دل میں خلافت کا خیال پیدا ہو گیا تھا۔ حضرت علیؓ نے مطمئن تھے کہ خلافت کسی اور کے پاس نہیں جائے گی۔ لیکن حضرت عباسؓ کا اندازہ کچھ اور تھا۔ اس لئے وہ اس بارے میں بھی اگر ہم سے (خلافت حضرت علیؓ کے متعلق) توضیح کر لینا چاہتے تھے۔ اس پر حضرت علیؓ نے جو جواب دیا وہ قابل غور ہے۔ یعنی اگر ہم نے رسول اللہؐ سے پوچھ لیا اور آپؐ نے انکار کر دیا تو پھر ہمارے لئے کوئی گنہائش

طہین القوسین عبارت بخاری میں نہیں ہے مگر علامہ عینی نے مراسیل شعبی سے اس اضافہ کو نقل کیا ہے۔

(CHANCE) نہیں رہے گا۔

شیعہ حضرات کے ہاں یہ عقیدہ ہے کہ جس طرح نبوت خدا کی طرف سے وہی طور پر ملتی ہے اور اس میں انتخاب اور مشورہ کا کوئی سوال نہیں، اسی طرح خلافت (امامت) بھی خدا کی طرف سے موعودیت ہے۔ اس میں انتخاب وغیرہ کا کوئی سوال نہیں۔ امام، خدا کی طرف سے مخصوص اور مقرر ہوتا ہے، یہ امامت حضرت علیؑ اور آپؐ کی اولاد، خدا کی طرف سے مقرر کردہ ہے۔

لیکن سنی حضرات کا یہ عقیدہ نہیں۔ ان کے نزدیک، خلیفہ امت کے مشورہ سے منتخب ہوتا ہے۔ نہ ہی خلافت کوئی جائیداد ہے، جو متوفی کے بعد اس کے رشتہ داروں کو بطور ترکہ مل سکتی ہے۔ یہ تصور کہ حکومت باپ کے بعد بیٹے کو وراثت میں ملتی ہے، ملکیت ہے جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔

**اگر اس روایت کو صحیح مانا جائے تو.....** | جو روایت اوپر درج کی گئی ہے وہ شیعہ حضرات کی نہیں، سنیوں کی

حدیث کی سب سے معتبر کتاب بخاری میں درج ہے۔ اب آپؐ انور فرمائیے کہ اگر اس حدیث کو صحیح مان لیا جائے تو رسول اللہؐ کے قریب ترین صحابہؓ اور حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ کے متعلق کیا تصور قائم ہوتا ہے؟ یہ تصور کہ وہ (معاذ اللہ) اسلام کے ابتدائی اور بنیادی اصول کو بھی نہیں سمجھ سکے تھے کہ خلافت بطور وراثت یا استحقاق نہیں ملتی۔ یہ معاملہ امت کے باہمی مشورہ سے طے ہوتا ہے، پھر جو جواب حضرت علیؓ کی طرف منسوب کیا گیا ہے اس سے ان کی سیرت و کردار پر جو رد پڑتی ہے وہ بھی کسی تشریح کی محتاج نہیں۔

(۰)

اب آگے بڑھیے۔ نبی اکرمؐ اس دنیا سے تشریف لے گئے۔ چونکہ خلافت (جانشینی رسولؐ) کا معاملہ امت کے باہمی مشورہ سے طے ہونا تھا۔ اس لئے حضورؐ نے اس کے متعلق کوئی وصیت نہیں فرمائی تاکہ امت کی تباہی نہ لے کر کسی قسم کی پابندی عائد نہ ہو جائے۔ چونکہ یہ معاملہ بہت اہم تھا۔ مرکز ملت کے بغیر دین کا

نقص ہی نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے ایسا نظر آتا ہے کہ امت نے حضورؐ کی تجویز و تکفین سے بھی پہلے اسے طے کر لینا ضروری سمجھا۔ تاریخ

ہمیں بتاتی ہے کہ سفیقہ بنی ساعدہ میں انصار کا اجتماع ہوا۔ جس حضرت سعد بن عبادہؓ کو خلافت کا امیدوار قرار دیا گیا۔ ایک روایت کے مطابق وہاں یہ تجویز بھی سامنے لائی گئی کہ ایک امیر انصار میں سے ہو اور ایک مہاجرین میں سے۔ اس وقت مہاجرین (حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور دیگر صحابہؓ) بھی وہاں پہنچ گئے۔ اس اجتماع کی جو روایت تاریخ میں بیان ہوئی ہے وہ قابل غور ہے۔ کہا گیا ہے کہ (انصار میں سے) حضرت جابر بن منذرؓ نے حسب ذیل تقریر فرمائی۔

اے انصار! امارت اپنے ہاتھوں ہی میں رکھو، کیونکہ لوگ تمہارے مطیع رہیں۔ کسی شخص میں یہ جرات نہ ہوگی کہ وہ تمہارے خلاف آواز اٹھا سکے یا تمہاری رائے کے خلاف کوئی کام کر سکے۔ تم اہل عزت و



## حضرت حبابؓ کی تقریر

ثروت ہو۔ تم تعداد اور بھرپور کی بنا پر دوسروں

بڑھ چڑھ کر ہو۔ تم بہادر اور دلیر لوگوں کی نگاہیں تمہاری طرف لگی ہوئی ہیں۔ ایسی حالت میں تم ایک دوسرے کی مخالفت کر کے اپنا معاملہ خراب نہ کرو۔ یہ لوگ تمہاری بات ماننے پر مجبور ہیں۔ زیادہ سے زیادہ رعایت جو ہم انہیں دے سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ ایک امیر ہم میں سے ہو اور ایک ان میں سے۔

(محمد حسین بیگل کی کتاب۔ ابو بکر صدیق اکبرؓ ص ۱۸)

آپ نے غور فرمایا۔ ہماری تاریخ کا یہ بیان اُن انصار (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کے متعلق ہے جن کے ہاجرین کے ساتھ قریشیہ تعلقات اور بے لوث اثبات کی شہادت خود اللہ تعالیٰ نے دی ہے۔ (تاریخ کے بیان کے مطابق) اُن کی طرف سے ان جذبات کا اظہار اس وقت ہو رہا ہے۔ جب نبی اکرمؐ کی نقش مبارک بھی ہنوز آنکھوں کے سامنے ہے۔

یہ تو ہ انصار کے متعلق۔ اب ہاجرین کی اہم سنیے (تاریخ بتاتی ہے کہ) اس کے جواب میں حضرت عمرؓ نے حسب ذیل تقریر فرمائی :-

## حضرت عمرؓ کی تقریر

ایک میان میں دو قیادیں جمع نہیں ہو سکتیں۔ اللہ کی قسم!

عرب تمہیں امیر بنانے پر ہرگز رضامند نہ ہوں گے۔ جب

رسول اللہؐ تم میں سے نہ تھے۔ ہاں! اگر امارت ان لوگوں کے ہاتھوں میں آئے جی میں رسول اللہؐ

مبعوث ہوئے تھے تو انہیں کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ اگر عربوں کے کسی طبقے نے ہماری امارت اور

خلافت سے انکار کیا تو اس کے خلاف ہمارے ہاتھ میں دلائل ظاہرہ اور براہین قاطعہ ہوں گے

رسول اللہؐ کی جانشینی اور امارت کے بارے میں کون شخص ہم سے جھگڑا کر سکتا ہے۔ جب

ہم آپ کے جاں نثار اور اہل عشیرہ ہیں۔ اس معاملہ میں ہم سے جھگڑا کرنے والا وہی شخص ہو سکتا

ہے جو باطل کا پیروکار ہو گناہوں سے آلودہ اور ہلاکت کے گڑھے میں گرنے کے لئے تیار ہو۔

(ابو بکر صدیقؓ از بیگل ص ۱۸)

اس کے جواب میں حضرت حبابؓ نے انصار سے کہا :-

اے انصار! تم ہمت سے کام لو اور عمرؓ اور اس کے ساتھیوں کی بات نہ سنو! اگر تم نے

اس وقت کمزوری دکھائی تو یہ سلطنت میں سے تمہارا حصہ غصب کر لیں گے۔ اگر یہ تمہاری مخالفت

کریں تو انہیں یہاں سے جلا وطن کر دو اور سلطنت پر خود قابض ہو جاؤ۔ کیونکہ اللہ کی قسم!

تمہیں اس کے سب سے زیادہ حق دار ہو۔ تمہاری ہی تلواروں کی بدولت اسلام کو شان شوکت

نصیب ہوئی ہے اس لئے اس کی قدر و منزلت کا موجب تمہیں ہو۔ تمہیں اسلام کو پیانا دینے

والے اور اس کی پشت پناہ جو۔ اور اگر تم بپا ہو تو اسے اس کی شان و شوکت سے محروم بھی کر سکتے  
(ایضاً - ص ۱۰۹ - ۱۰۸)

**انداز گفتگو:** حضرت عمرؓ نے یہ فقرہ سنا تو کہا:-  
اگر تم نے اس قسم کی کوشش کی تو اللہ تمہیں ہلاک کر ڈالے گا۔ (ایضاً صفحہ ۱۰۸)

اس کے جواب میں حضرت حبابؓ نے کہا:-  
میں نہیں اللہ تمہیں ہلاک کرے گا۔ (ایضاً - ص ۱۰۹)  
یہ ہے ہماری تاریخ کے مطابق ان صحابہؓ کے باہمی تعلقات کا نقشہ جن کے متعلق اللہ تعالیٰ یہ بڑی بڑی عطا فرماتا ہے کہ **أَشَدَّ أَعْوَى الْكُفَّارِ مَحَمَّادٌ وَبَيْتُهُمْ**۔ (۱) وہ کفار کے مقابلہ بڑے سخت اور آپس میں بڑے ہمدرد تھے۔ وہ جن کے متعلق خدا کا ارشاد ہے کہ **وَأَلْفَ بَيْنٍ فَتَوْبِعُهُمْ**۔ (۲) ان کے دلوں میں نہالنے باہمی محبت اور الفت ڈال دی۔ وہ محبت اور الفت جو دنیا بھر کی مددیت دے کر بھی خریدی نہیں جاسکتی۔ (۳) ان صحابہؓ کے باہمی تعلقات اور اخلاق کے متعلق ہماری تاریخ یہ نقشہ پیش کرتی ہے۔

حضرت عمرؓ کی جو تقریر (تاریخ کے بیان کے مطابق) اوپر درج کی گئی ہے اس میں انہوں نے اپنے  
(یعنی مہاجرین کے) حق خلافت کے متعلق یہ دلیل دی ہے کہ  
رسول اللہؐ کی ہائشی اور امارت کے بارے میں ہم سے کون جھگڑ سکتا ہے۔ جب ہم آپ کے  
جاں نثار اور اہل عشیرہ (اہل خاندان) ہیں۔

یہ دلیل قابل غور ہے۔ اس سے پیشتر ہم دیکھ چکے ہیں کہ تاریخ ہمیں حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ کے متعلق یہ  
باور کرانا چاہتی ہے کہ ان کے نزدیک خلافت حضورؐ کے قرابت داروں کو ورثہ میں ملنی چاہیے تھی۔ اب حضرت  
عمرؓ کے متعلق یہ بتایا جاتا ہے کہ انہوں نے بھی استحقاق خلافت کے لئے یہی دلیل دی کہ ہم رسول اللہؐ کے  
اہل خاندان ہیں۔ غور کیجئے کہ اس سے ہماری تاریخ ہمیں کہاں لے جانا چاہتی ہے۔

لیکن تاریخ ہمیں تک نہیں رہتی۔ وہ ایک قدم آگے بڑھاتی ہے اور بتاتی ہے کہ جب معاملہ زیادہ ذرا اختیار  
کر گیا تو حضرت ابوبکرؓ اٹھنے اور آپؐ نے فرمایا کہ اس باب میں انصار کا دعویٰ یکسر بے بنیاد ہے۔ رسول اللہؐ  
نے فیصلہ کر دیا ہوا ہے کہ **الْأَشْهَادُ مِنْ قُرَيْشٍ** خلافت قریش  
میں رہے گی۔ اس پر انصار خاموش ہو گئے اور حضرت ابوبکرؓ علیہ  
**الْأَشْهَادُ مِنْ قُرَيْشٍ** منتخب کر لئے گئے۔

یہ حدیث، متفق علیہ طور پر صحیح مانی جاتی ہے۔ لیکن آپؐ ذرا اس کی گہرائی میں جائیے اور سوچئے کہ یہ  
کبھی رسول اللہؐ کا ارشاد ہو سکتا ہے؟ قرآن مسلسل دستورات اور غلوں کے امتیازات مٹا کر مساوات  
انسانیہ اور نیکویم آدمیت کی تعلیم دیتا رہا۔ حضورؐ کی سادہ زندگی اس بلند و برتر تعلیم کا عملی نمونہ ہی۔ آپؐ اس  
امر کا تصور بھی کر سکتے ہیں کہ اس تعلیم کا حامل رسولؐ یہ فیصلہ کرے گا کہ حکومت میرے قبیلہ کے اندر رہے گی۔

یہ ایک روایت قرآن کی بنیادی تعلیم اور نبی اکرم کے اسوۂ حسنہ کو باطل قرار دے دینے کے لئے کافی ہے۔ لیکن ہماری تاریخ اس روایت کو رسول اللہ کی طرف منسوب کرتی ہے اور یہ کہتی ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے انصار اور مہاجرین کے بھرے مجمع میں اسے سختی سے خلاف کے لئے بطور دلیل پیش کیا اور اسے سب سے تسلیم کر لیا۔ یعنی ہماری تاریخ، ایک ہی واقعہ میں، خدا کے رسولؐ اور..... صحابہ کبارؓ کے متعلق نسل پرستی کا ایسا تصور پیدا کر جاتی ہے جسے مٹانے کے لئے قرآن آیا تھا۔

(۱)

رسول اللہ کی وفات کے فوری بعد، صحابہ کبارؓ (انصار و مہاجرین) کا جو پہلا اجتماع ہوا، اس میں ہماری تاریخ (کے مطابق) ان حضرات کے باہمی تعلقات، اندازہ گفتگو اور مصلوب دلائل کا نقشہ ہمارے سامنے آگیا۔ اب اس سے آگے بڑھئے۔ (امام طبری اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں:-

## دست و گریباں

سابقہ روایت کے سلسلہ سے عبداللہ بن عبدالرحمن سے مروی ہے کہ اب ہر طرف سے لوگ آکر ابو بکرؓ کی بیعت کرنے لگے۔ قریب تھا کہ وہ سترہ گوروند ڈالتے۔ اس پر سعدؓ کے کسی آدمی نے کہا کہ سعدؓ کو بچاؤ ان کو نہ روندو، عمروؓ نے کہا اللہ اسے ہلاک کرے اس کو قتل کر دو اور خود ان کے سرانے آکر کھڑے ہو گئے اور کہا کہ میں چاہتا ہوں تم کو روند کر ہلاک کر دوں۔ سعدؓ نے عمروؓ کی داڑھی پکڑ لی عمروؓ نے کہا چھوڑو اگر اس کا ایک بال بھی جھیکا ہوا تو تمہارے منہ میں ایک دانت نہ رہے گا۔ ابو بکرؓ نے کہا عمروؓ خاموش رہو اس موقع پر نرمی برتنا زیادہ سودمند ہے۔ عمروؓ نے سعدؓ کا پیچھا چھوڑ دیا سعدؓ نے کہا اگر مجھ میں اٹھنے کی بھی طاقت ہوتی تو میں تمام مدینے کی گلی کوچوں کو اپنے حامیوں سے بھر دیتا کہ تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے ہوش و حواس جاتے رہتے اور بخدا اس وقت میں تم کو ایسی قوم کے حوالے کر دیتا جو میری بابت نہیں مانتے بلکہ میں ان کا اتباع کرتا۔ اچھا اب مجھے یہاں سے اٹھالے چلو۔ ان کے آدمیوں نے ان کے آدمیوں نے ان کو اٹھا کر ان کے گھر میں پہنچا دیا۔ چند روز ان سے تعارض نہیں کیا گیا۔ اس کے بعد ان سے کہلا بھیجا کہ چونکہ تمام لوگوں نے اور خود تمہاری قوم نے بھی بیعت کر لی ہے تم بھی اگر بیعت کر لو۔ سعدؓ نے کہا یہ نہیں ہو سکتا تاؤ قتیقہ میں تمہارے مقابلہ میں اپنا ترکش خالی کر دوں۔ اپنے نیزے کو تمہارے خون سے رنگیں نہ کر لوں اور اپنی تلوار سے جس پر میرا بس چلے وار نہ کر لوں اور اپنے خاندان اور قوم کے ان افراد کے ساتھ جو میرا ساتھ دیں تم سے لڑ نہ لوں، ہرگز بیعت نہ کر دوں گا۔ خدا کی قسم، اگر انسانوں کے ساتھ جن بھی تمہارے ساتھ ہو جائیں تب بھی جب تک کہ میں اپنے معاملے کو اپنے رب کے سامنے پیش نہ کر لوں بیعت نہیں کر دوں گا۔

(تاریخ طبری، جلد اول، حصہ چہارم۔ اردو ترجمہ، شائع کردہ، جامو عثمانیہ، ص ۶۷)

اس سے ایک صفحہ آگے ہے:-



**معاذ اللہ** ضحاک بن خلیفہ سے مروی ہے کہ امارت کے انتخاب کے موقع پر حجاب بن المنذر نے کھڑے ہو کر تلوار نکال لی اور کہا کہ میں ابھی اس کا تصفیہ کر دیتا ہوں۔ میں شیر ہونے اور شیر کی کھوہ میں ہوں اور شیر کا بیٹا ہوں پھر نے اس پر حملہ کیا اور اس کے دامن پر وار کیا۔ تلوار گر پڑی، عمر بن نے اسے اٹھا لیا اور پھر سعد پر چھپنے اور لوگ بھی سعد پر چھپے۔ اب شب نے باری باری آکر بیعت کی۔ سعد بن نے بھی بیعت کی۔ اس وقت عہد جاہلیت کا سامنظر پیش آیا اور تو تو میں ہیں ہونے لگی۔ ابوبکر بن اس سے دور رہے، جس وقت سعد بن پر لوگ چڑھ گئے کسی نے کہا کہ تم لوگوں نے سعد بن کو مار ڈالا۔ عمر بن نے کہا اللہ اسے ہلاک کر دے۔ وہ منافق ہے عمر بن کی تلوار کے سامنے ایک پتھر آگیا اور ان کی ضرب سے وہ قطع ہو گیا۔

کلیجے پر دم فخر کھینچے اور اس فقرہ کو پھر پڑھئے۔

اس وقت عہد جاہلیت کا سامنظر پیش آیا اور تو تو میں ہیں ہونے لگی۔

بہر حال حضرت ابوبکر بن خلیفہ منتخب ہو گئے۔ اس کے بعد دوسرے امیدوار حضرت سعد کا کیا طریقہ عمل رہا؟ سنئے۔ اس کے بعد سعد بن نے ابوبکر بن کی امامت میں نماز پڑھتے تھے اور نہ جماعت میں شریک ہوتے تھے حج میں بھی مناسک ان کے سامنے ادا نہیں کرتے تھے۔ ابوبکر بن کے انتقال تک ان کی یہی روش رہی۔

(طبری - ص ۷)

**دارِ حیاں نو چنا!** ہم ادھر دیکھ چکے ہیں کہ سفیفہ کے تنازعے میں حضرت سعد بن نے حضرت عمر بن کی دارِ حیاں پکڑ لی تھی۔ تاریخ طبری میں بتاتی تھی کہ ایک دوسرے کی دارِ حیاں نو چنا (سنا ذلہ) ان حضرات کا معمول سا ہو گیا تھا۔ چنانچہ لکھا ہے کہ جب حضرت اسامہ بن کی امارت عساکر کے مسئلہ میں حضرت عمر بن اور حضرت ابوبکر بن میں اختلاف رائے ہوا تو

ابوبکر بن جو بیٹھے ہوئے تھے غصے سے اچھل پڑے اور بڑھ کر انہوں نے عمر بن کی دارِ حیاں پکڑ لی اور کہا۔

اے ابن خطاب! اللہ تیری ماں کا بڑا کرے کہ تم سر جاتے۔ بھلا جس شخص کو رسول اللہ نے اس

پر نازل کیا ہے۔ تم مجھ سے کہتے ہو کہ میں اسے علیہ کر دوں۔ (ایضاً - ص ۱۲)

یہ جملہ معزز تھا۔ اب پھر انتخاب خلیفہ اول کی تاریخی داستان کی طرف آئیے۔ اس تمام واقعہ میں حضرت علی بن کا ابھی تک ذکر نہیں آیا۔ آپ یقیناً یہ معلوم کرنے کے لئے مشوش ہوں گے کہ جن بزرگوار (یعنی حضرت علی بن) کے دل میں سب سے پہلے خلافت کا خیال پیدا ہوا تھا، حضرت ابوبکر بن کے انتخاب پر ان کی طرف سے کیا رد عمل ہوا۔ تاریخ اس کے متعلق تفصیل سے بتاتی ہے۔ سینے محمد حسین ہیکل (مصری) اپنی کتاب میں لکھتا ہے۔

**حضرت علی کا رد عمل** مہاجرین اور انصار کے چند افراد حضرت ابوبکر بن کی بیعت میں

شامل نہ تھے بلکہ ان کا میلان حضرت علی بن بن ابی طالب کی

طرف تھا۔ ان میں سے مشہور لوگ تھے۔ عباس بن عبد المطلب، فضل بن عباس، زبیر بن عوام بن

العاص، خالد بن سہیل، مقداد بن عمرو، سلمان فارسی، ابوذر غفاری، عامر بن یاسر، بلال بن حارث،

ابن کعب۔ ابو بکرؓ نے عمرو، ابو عبیدہ بن جراح، مغیرہ بن شعبہؓ سے ان لوگوں کے بارے میں مشورہ کیا۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ آپ عباسؓ بن عبدالمطلب سے ملے اور خلافت میں اُن کا حصہ بھی لکھ دیجئے جو ان کی اولاد کی طرف منتقل ہو جائے۔ اس طرح ان کے اور ان کے بھتیجے علیؓ بن ابی طالب کے درمیان اختلاف واقع ہو جائے گا اور یہ بات آپ کو علیؓ کے مقابل میں فائدہ مند ثابت ہوگی۔

اس مشورہ کے مطابق ابو بکرؓ عباسؓ سے ملے تو دونوں کے درمیان طویل گفتگو ہوئی۔ حضرت ابو بکرؓ نے کہا: آپ رسول اللہؐ کے چچا ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ خلافت میں آپ کا حصہ بھی موجود ہو۔ جو آپ کے بعد آپ کی اولاد میں منتقل ہوتا رہے۔ لیکن عباسؓ نے یہ پیش کش رد کر دی کہ اگر خلافت ہمارا حق ہے تو ہم ادھوری خلافت لینے پر رضامند نہیں ہو سکتے۔ (ابو بکرؓ) اس کے بعد سبکدوش ہوئے۔

ایک اور روایت میں جسے یعقوبی اور بعض دیگر مؤرخین نے بھی ذکر کیا ہے مذکور ہے کہ مہاجرین اور انصار کی ایک جماعت حضرت علیؓ کی بیعت کرنے کے ارادے سے حضرت فاطمہ الزہراءؓ بنت رسول اللہؐ کے گھر میں جمع ہوئی۔ ان میں خالد بن سعید بھی تھے۔ خالدؓ نے حضرت علیؓ سے کہا: "اللہ کی قسم! رسول اللہؐ کی جائزینی کے لئے آپ سے بہتر اور کوئی آدمی نہیں۔ اس لئے آپ ہماری بیعت قبول کیجئے۔"

جب حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کو اس اجتماع کی خبر ملی تو وہ چند لوگوں کو لے کر حضرت فاطمہؓ کے گھر پہنچے اور اس پر حملہ کر دیا۔ حضرت علیؓ تلوار ہاتھ میں لے کر گھر سے باہر نکلے۔ سب سے پہلے ان کی ڈھکیڑھ حضرت عمرؓ سے ہوئی۔ حضرت عمرؓ نے ان کی تلوار توڑ ڈالی اور وہ دوسرے لوگوں کے ہمراہ گھر میں داخل ہو گئے۔ اس چھڑت فاطمہؓ گھر سے باہر آئیں اور کہا: "یا تو تم میرے گھر سے نکل جاؤ ورنہ اللہ کی قسم میں اپنے سر کے بال توچ لوں گی۔ اور تمہارا خلافت اللہؐ سے مدد طلب کروں گی۔ حضرت فاطمہؓ کی زبان سے یہ الفاظ سن کر سب لوگ گھر سے باہر نکل گئے۔

کچھ روز تک تو مذکورہ بالا اصحاب بیعت سے انکار کرتے رہے۔ لیکن آہستہ آہستہ یکے بعد دیگرے سب نے بیعت کر لی۔ سوا حضرت علیؓ کے جنہوں نے چھ سات مہینے تک بیعت نہ کی۔ مگر حضرت فاطمہؓ کی وفات کے انہوں نے بھی بیعت کر لی۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت علیؓ نے چالیس روز بعد بیعت کر لی تھی۔ ایک اور روایت میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت عمرؓ نے ارادہ کر لیا تھا کہ اگر نبیؐ شہید ہو جائے تو حضرت فاطمہؓ کے گھر میں خفیہ مجالس منعقد کرنے سے باز نہ آئے تو وہ اپنے چچا کے گھر کو آگ لگا دیں گے۔ (ابن اسحاق)

اس وقت تک جو کچھ سامنے آیا ہے۔ اس میں یہ نہیں بتایا گیا کہ حضرت علیؓ نے اپنے موقف کی تائید میں دلیل کیا

پیش کی تھی۔ اب وہ دلیل سنئے۔ ہیکل نکلتا ہے۔

**حضرت علیؓ کی دلیل** حضرت علیؓ اور دیگر بنی ہاشم کے بیعت نہ کرنے سے متعلق

مشہور ترین روایت وہ ہے جو ابن قتیبہ نے اپنی کتاب "الامانۃ والسیامتہ" میں درج کی ہے۔ وہ یہ کہ حضرت ابو بکرؓ کی بیعت کے بعد حضرت عمرؓ چند لوگوں کو ساتھ لے کر بنی ہاشم کے پاس گئے جو اس وقت حضرت علیؓ کے گھر جمع تھے تاکہ ان سے بھی بیعت کا مطالبہ کریں۔ لیکن سب لوگوں نے حضرت عمرؓ کا مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا۔ زبیر بن عوام تو تلواریں ہاتھ میں لے کر حضرت عمرؓ کے مقابلہ کے لئے باہر نکل آئے۔ یہ دیکھ کر حضرت عمرؓ نے اپنے ساتھیوں سے کہا:-

"زبیرؓ کو بکڑ لو"

لوگوں نے زبیرؓ کو پکڑ کر تلواریں ان کے ہاتھ سے پھین لی۔ اس پر مجبوراً زبیرؓ نے جا کر حضرت ابو بکرؓ کی بیعت کر لی۔ حضرت علیؓ رضی اللہ عنہ سے بھی بیعت کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ لیکن انہوں نے انکار کر دیا اور کہا:- میں تمہاری بیعت نہ کروں گا کیونکہ میں تم سے زیادہ خلافت کا حقدار ہوں اور تمہیں میری بیعت کرنی چاہیے تھی۔ تم نے یہ کہہ کر انصار کی بیعت کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ ہم رسول اللہؐ کے قریبی عزیز ہیں اور آپؐ کے قریبی عزیز ہی خلافت کے حقدار ہیں۔ اس اصول کے مطابق تمہیں چاہیے تھا کہ خلافت ہمارے حوالے کرتے مگر تم نے اہل بیت سے چھین کر خلافت غصب کر لی۔ کیا تم نے انصار کے سامنے یہ دلیل پیش نہ کی تھی کہ ہم خلافت کے زیادہ حقدار ہیں کیونکہ رسول اللہؐ ہم میں سے تھے۔ اس لئے تم ہماری اطاعت قبول کرو اور خلافت ہمارے حوالے کرو ورنہ یہی دلیل جو تم نے انصار کے مقابلے میں پیش کی تھی اب میں تمہارے مقابلے میں پیش کرتا ہوں۔ ہم تم سے زیادہ رسول اللہؐ کے قریبی عزیز ہیں۔ اس لئے خلافت ہمارا حق ہے۔ اگر تم میں ذرہ برابر ایمان ہے تو ہم سے انصاف کر کے خلافت ہمارے حوالے کرو۔ لیکن اگر تمہیں ظالم بننا پسند ہے تو جو تمہارا جی چاہے کرو تمہیں اختیار ہے۔ (ایضاً ص ۱۲۱)

آپؐ نے غور فرمایا کہ تاریخ نے جو دلیل حضرت عمرؓ اور حضرت ابو بکرؓ کی طرف منسوب کی تھی (کہ خلافت قریش میں رہے گی اور ہم رسول اللہؐ کے اہل خاندان ہیں) اسے (تاریخ نے) کس سادگی سے حضرت علیؓ کی طرف لٹایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دلیل کے بعد سبھی حضرات کا موقف اس قدر کمزور ہو جاتا ہے کہ ان سے کوئی اطمینان بخش جواب نہیں بن پڑ سکتا۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ (تاریخ نے) یہ دلیل اولاً حضرات شیخیںؓ کی طرف کیوں منسوب کی تھی!

بہر حال حضرت علیؓ کے اس جواب پر حضرت عمرؓ نے کہا:-

میں اس وقت تک آپؐ کو نہ چھڑوں گا جب تک آپؐ بیعت نہ کریں گے۔ (ایضاً ص ۱۲۲)

اس کے بعد:-



## سرگرمیاں

حضرت علی رضی اللہ عنہ اس وقت تیزی میں آگے اور کہنے لگے: "مگر تم شوق سے دوڑو دو جو جس میں تمہارا بھی حصہ ہے آج تم اس لئے خلافت ابوبکرؓ کی حمایت کر رہے ہو کہ کل کو خلافت تمہارے پاس لوٹ آئے گی لیکن میں کبھی ان کی بیعت نہ کروں گا۔" حضرت ابوبکرؓ کو ڈر پیدا ہوا کہ کہیں بات بڑھ نہ جائے اور درشت کلامی تک نوبت نہ آجائے انہوں نے کہا: "علیؓ! اگر تم بیعت نہیں کرتے تو میں بھی تمہیں مجبور نہیں کرتا۔"

اس پر ابوعبیدہ بن الجراح حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوئے اور نہایت نرمی سے کہا: "بھتیجا! تم ابھی کم عمر ہو اور یہ لوگ بزرگ ہیں۔ نہ تمہیں ان جیسا تجربہ حاصل ہے اور نہ تم ان کی طرح جاننا ہو۔ اگر قوم میں کوئی شخص رسول اللہؐ کی جانشینی کے فرائض صحیح طور پر نبی لا سکتا اور خلافت کا بوجھ کما حقہ اٹھا سکتا ہے تو وہ صرف ابوبکرؓ ہیں اس لئے تم ان کی خلافت قبول کر لو۔ اگر تم نے لمبی عمر پائی تو یقیناً اپنے علم و فضل، دینی اور دنیوی فہم و ذکا، و ساقیبت اسلام، حسب و نسب اور رسول اللہؐ کی دامادی کا شرف حاصل ہونے سے باعث تمہیں خلافت کے مستحق ٹھہرو گے۔"

پرسن کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے جوش کی انتہا نہ رہی اور وہ غصے سے بولے: "اللہ اللہ! اگر وہ مہاجرین! تم رسول اللہؐ کی حکومت کو آپ کے گھر سے نکال کر اپنے گھروں میں داخل نہ کرو۔ آپ کے اہل بیت کو ان کے صحیح مقام پر سرفراز کرو اور ان کا حق انہیں دو۔" اسے مہاجرین! اللہ کی قسم! یہیں خلافت اور حکومت کے مستحق ہیں۔ کیونکہ ہم اہل بیت ہیں۔ ہم اس وقت تک اس کے حقدار ہیں جب تک ہم میں اللہ کی کتاب کا تاری، دین کا فقیہ، رسول اللہؐ کی سنت کا عالم و رعایا کی ضرورت سے واقف، ان کی تکالیف کو دور کرنے والا اور ان سے مساوات کا سلوک کرنے والا قائم ہے اور اللہ جانتا ہے کہ ہم میں ان صفات کا حامل موجود ہے، اس لئے اپنی خواہشات کی پیروی کر کے اللہ کے راستے سے گمراہی اختیار نہ کرو۔ اور حق کے راستے سے دور نہ چلے جاؤ۔" مادوں کے بیان کے مطابق بشیر بن سعد بھی اس موقع پر موجود تھے۔ جب انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی باتیں سنیں تو کہا: "اے علیؓ! اگر یہ باتیں جو اس وقت تم نے کہی ہیں انصار کا گروہ ابوبکرؓ کی بیعت سے پہلے سن لیتا تو وہ لوگ تمہارے سوا کسی کی بیعت نہ کرتے۔"

اس گفتگو کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ پیش میں بھیجے ہوئے گھر چلے گئے۔ جب رات ہوئی تو وہ حضرت فاطمہؓ کو لے کر باہر آئے اور انہیں ایک خیمہ پر بٹھا کر انصار کے پاس لے گئے۔ حضرت فاطمہؓ گھر گھر جاتیں اور ان سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مدد کرنے کی درخواست کرتیں۔ لیکن ہر جگہ سے انہیں یہی جواب ملتا۔

لئے منتخب رسول اللہؐ! ہم ابوبکرؓ کی بیعت کر چکے ہیں۔ اگر آپ کے خاوند بیعت سے قبل تمہارے پاس آئے تو ہم ضرور ان کی بیعت کر لیتے۔ پرسن کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ میں اگر جواب دیتے۔ کیا میں رسول اللہؐ کی لعش کو بلا تمہیں و تکفین

چھوڑ دیتا اور باہر نکل کر آپ کی جانشینی کے متعلق لڑتا جھگڑتا پھرتا ہے  
حضرت فاطمہؓ بھی کہتیں: "ابوالحسن (علیؑ) نے وہی کیا جو ان کے لئے مناسب تھا۔ باقی  
ان لوگوں نے جو کچھ کیا اللہ ان سے ضرور اس کا حساب لے گا اور باز پرس کرے گا۔"  
(ایضاً - صفحہ ۱۲۰-۱۲۱)

ہیکل نے ان واقعات کو مختلف حوالوں سے نقل کیا ہے۔ اس باب میں بخاری میں حسب ذیل روایت آئی ہے:-

حضرت فاطمہؓ بنی سلم کے بعد چھ ماہ تک زندہ رہیں۔ جب  
ان کا انتقال ہوا تو ان کے شوہر علیؑ نے رات کو ان کو دفن

## بخاری کی حدیث

کر دیا اور ان کے انتقال کی ابو بکرؓ کو اطلاع نہیں دی بلکہ خود ہی نماز پڑھ لی۔ اور عینک حضرت  
فاطمہؓ زندہ رہیں لوگوں کی نگاہوں میں حضرت علیؑ کا ایک خاص وقار رہا۔ لیکن جب حضرت فاطمہؓ  
کا انتقال ہو گیا تو حضرت علیؑ نے محسوس کیا کہ لوگوں کے چہرے اب بدل گئے ہیں تو اب انہوں  
نے حضرت ابو بکرؓ سے صلح کر لینے اور بیعت کرنے کی خواہش کی۔ ان چھ ماہ تک انہوں نے  
بیعت نہیں کی تھی۔ چنانچہ انہوں نے ابو بکرؓ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ ہمارے پاس تشریف لائے۔  
مگر آپ کے ساتھ کوئی دوسرا شخص نہ آئے۔ حضرت علیؑ کو یہ بات گوارا نہیں تھی کہ وہ حضرت  
خمرہؓ کو ساتھ لائیں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا: "نہیں خدا کی قسم آپ ان کے ہاں تنہا نہیں جا سکیں گے۔"  
اس پر حضرت صدیقؓ نے کہا: "تم کیا سمجھتے ہو۔ وہ میرا کیا کر لیں گے۔ خدا کی قسم میں ان کے پاس ضرور  
جاؤں گا۔ چنانچہ صدیق اکبرؓ تشریف لے گئے تو حضرت علیؑ نے خطبہ پڑھا اور فرمایا: "ہم آپ کی  
فضیلت کو اور جو کچھ خدا نے آپ کو عطا کیا ہے اسے پہچانتے ہیں اور کسی مصلحتی پر جو حق تعالیٰ آپ  
کو عطا فرمائے ہم حسد نہیں کرتے لیکن تم نے امر خلافت میں ہمارے خلاف استبداد سے کام لیا ہے  
ہم سمجھتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہماری قرابت کی وجہ سے اس میں ہمارا حصہ ہے۔"  
ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد ابو بکرؓ صدیق منبر پر چڑھے اور خطبہ دیا، اور بیعت سے علیؑ کے

طبعیہ اسے سند کے ساتھ ابن جریر طبری نے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے۔ انہوں نے اسی کے ساتھ اتنا  
امضافہ کیا ہے: "معمر کہتے ہیں کہ کسی نے ابن شہابؓ زہری سے پوچھا کہ کیا حضرت علیؑ نے چھ ماہ تک  
ابو بکرؓ کی بیعت نہیں کی تو انہوں نے جواب دیا کہ نہیں یہ حضرت علیؑ نے بیعت کی اور نہ ہی بنو ہاشم میں سے  
کسی اور نے بیعت کی۔ حتیٰ کہ چھ ماہ بعد حضرت علیؑ نے بیعت کر لی تو بنو ہاشم نے بھی بیعت کر لی۔"  
(ابن جریر طبری - جلد اول - حصہ سوم - اردو ترجمہ جامعہ عثمانیہ - صفحہ ۵۹۵)

۱۲ ابن جریر کی روایت کے مطابق حضرت علیؑ نے اس موقع پر تمام بنو ہاشم کو اپنے ہاں جمع کر لیا تھا۔ (ایضاً)  
۱۳ ابن جریر طبری نے اپنے ہاں یہ الفاظ نقل کئے ہیں کہ ولکننا کنا مذلی ان لنا فی هذا الامر حقاً فاستبدتہم بہ علیہما۔  
یعنی ہم یہ سمجھتے تھے کہ امر خلافت ہمارا حق ہے اور تم نے ہمارے خلاف استبداد سے کام لیا ہے۔ (ایضاً)

کے تحلف کی صورت کو بیان کیا اور جو غدار انہوں نے بیان کیا تھا اسے پیش کیا تھا اسے پیش کیا پھر مغفرت کی دعا مانگی اور (اس کے بعد) حضرت علیؓ نے خطبہ پڑھا اور حضرت ابو بکرؓ کے حق غلطی کو بیان کیا اور کہا کہ اب تک انہوں نے جو کچھ کیا ہے وہ ابو بکرؓ سے کسی جسد کی بنا پر نہیں کیا اور نہ اس فضیلت سے کسی انکار کی بنا پر جو خدا نے انہیں دی ہے بلکہ ہم سمجھتے تھے کہ امر خلافت میں ہمارا حصہ ہے اور ابو بکرؓ نے ہمارے خلاف استیاد سے کام لیا ہے۔ لہذا ہم اپنے دلوں میں ناراض تھے۔ (صحیح بخاری۔ کتاب المغازی)

بخاری کی اس روایت میں چند باتیں غری خور طلب ہیں۔ مثلاً

(۱) حضرت علیؓ رضی اللہ عنہ سے اس قدر ناراض تھے کہ انہوں نے حضرت فاطمہؓ کی وفات کی اطلاع تک نہیں دی۔ اور چپکے ہی چپکے انہیں رات کو دفن کر دیا۔

(۲) جب تک حضرت فاطمہؓ زندہ رہیں، حضرت علیؓ رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو بکرؓ کی بیعت نہ کی لیکن ان کی وفات کے فوری بعد انہوں نے محسوس کیا کہ لوگوں کی قظروں میں ان کا پہلا سادہ دار باقی نہیں رہا۔ اس لئے انہوں نے یہی مناسب سمجھا کہ حضرت ابو بکرؓ کی بیعت کر لی جائے۔

(۳) حضرت علیؓ رضی اللہ عنہ نے اپنے حق خلافت کے لئے یہ دلیل دی کہ وہ رسول اللہؐ کے قرابت دار ہیں۔

آپ غور کیجیے کہ تاریخ کے اس بیان کو اگر صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس سے حضرت علیؓ رضی اللہ عنہ کے متعلق کیا تصور قائم ہوتا ہے؟

تاریخ کے بیان بیان کے مطابق، حضرت علیؓ رضی اللہ عنہ نے یہ بھی کہا کہ جن لوگوں نے انہیں خلافت سے محروم رکھا ہے انہوں نے غصب اور استیاد سے کام لیا ہے۔ یہی وہ "جرم" ہے جس کی بنا پر شیعہ حضرات کا عقیدہ ہے کہ نبی اکرمؐ کی وفات کے بعد، ہجر چند اصحاب (جنہوں نے حضرت ابو بکرؓ کی بیعت نہیں کی تھی) باقی رہے۔

سب (معاذ اللہ) مرتد ہو گئے تھے۔ اس کے متعلق سنی حضرات یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ صحابہ کا ارتداد؟ عقیدہ لغصب پر معنی ہے۔ لیکن اس کا کیا جواب کہ خود ان کی (حدیث کی) منہ پر کتاب بخاری میں حسب ذیل روایت موجود ہے:-

حضرت ابن عباسؓ رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا کہ تم لوگ برہنہ پا۔ برہنہ بدن۔ بغیر نعلین کے حشر کئے جاؤ گے۔ آپؐ نے یہ آیت پڑھی۔ کَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نَّعِيدُهُ وَنَعْدُ اَعْلٰی سَنَا اَنَّا كُنَّا عَلَیْہِمْ (نہم) اور قیامت دن سب سے پہلے جسے کپڑے پہنائے جائیں گے وہ ابراہیمؑ ہیں۔ اور اس دن میرے چند صحابہؓ بائیں جانب (یعنی جہنم کی طرف) لئے جا رہے ہوں گے۔ میں کہوں گا یہ تو میرے صحابہؓ ہیں۔ پھر اللہ فرمائے گا یہ لوگ اپنے پھلے دیں پر لوٹ گئے تھے۔ جب آپؐ ان کے پاس سے گھما ہوئے۔ پس میں کہوں گا جیسا کہ نیک بندے



(یعنی عیسیٰؑ) نے کہا تھا۔ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتُ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ..... (۱۱۵)

(بخاری کتاب الانبیاء ترجمہ شائع کردہ نور محمد تاجر کتب کراچی۔ جلد دوم۔ ص ۱۴۹)

سوچئے کہ بخاری کی اس حدیث کی دوسری بات کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہے؟ یہ وہ صحابہ ہیں جن کے متعلق قرآن شہادت دیتا ہے کہ أَفَلَيْسَ ذَٰلِكُمْ اللَّهُمُّ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا..... (۱۱۶) یہی لوگ ہیں جو حقیقی یمن ہیں۔ اگر ان مومنین کے ایمان کی بھی یہ کیفیت تھی کہ اُدھر رسول اللہؐ نے آنکھیں بند کیں اور ادھر یہ (معاذ اللہ) ایمان سے پھر گئے، تو یہ دیگر اچر رسد؟ اور اگر کوئی معترض یہ کہہ دے (اور کہنے والے کہتے ہی ہیں) کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ تو سوچئے کہ (ان روایات کی زد سے) خود نبی اکرمؐ کے متعلق (معاذ اللہ) کیا تصور سامنے آتا ہے۔

(۱)

اس مقام پر آپ کے دل میں یہ خیال پیدا ہو گا کہ جس تاریخ کی یہ کیفیت ہے اسے مسترد کیوں نہ کر دیا جائے۔ اب اگر نے میں کونسا امر مانع ہے؟ یہ بات بڑی معقول ہے اور ایسا کرنے میں کوئی دقت نہیں ہونی چاہیے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہماری تاریخ کو تاریخ کے مقام سے اٹھا کر دین بنا لیا گیا ہے۔ ان احادیث کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ یہ خدا کی طرف سے، رسول اللہؐ کو بذریعہ وحی خفی ملی تھیں۔ اس لئے یہ قرآن کے ساتھ قرآن کی مثل ہیں اور مسئلہ معہ) اتنا ہی نہیں، ان کے متعلق یہ بھی عقیدہ ہے کہ اگر قرآن اور حدیث میں تضاد نظر آئے تو قرآن کو منسوخ سمجھو اور حدیث کو برقرار رکھو۔ کراچی کے ادارہ تحقیقی حق کی طرف سے ایک پمفلٹ شائع ہوا ہے جس کا نا ہے ”فتنہ انکار حدیث“ اس کے مصنف ہیں ”علامہ حافظ محمد ایوب صاحب دہلوی“ وہ اس پمفلٹ میں لکھتے ہیں:-

اگر کوئی کہے کہ فَاحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ (۱۱۷) کے کیا معنی ہیں۔ نبی سے یہ کہا جا رہا ہے کہ تو کتاب اللہ کے ساتھ ان کے درمیان فیصلہ کر۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ”مَا أَنزَلَ اللَّهُ“ کے معنی صرف کتاب اللہ نہیں ہے۔ بلکہ ”مَا أَنزَلَ اللَّهُ“ کتاب اللہ بھی ہے اور حدیث رسول اللہ بھی۔

(ص ۵۲)

اس کے بعد لکھتے ہیں:-

حدیث قرآن کو منسوخ کر دیتی ہے | لہٰذا یہ بات کہ قول رسول قرآن کے خلاف ہو تو وہ بھی حجت ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن میں ہے: كَتَبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدُكُمْ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةَ يَلْزَامُهَا... (۱۱۸) تمہارے اوپر والدین کی وصیت فرض ہے۔ اگر کسی نے مال چھوڑا ہے جب کہ اسے موت آئے۔ رسول اللہؐ نے فرمایا: لا وصية للمواريث۔ وارث کے لئے وصیت نہیں اور

تو اتر سے ثابت ہے کہ عمل اسی حدیث پر رہا ہے۔ یعنی وارث کے لئے وصیت ناجائز قرار دی گئی۔ حدیث نے قرآن کی آیت کو منسوخ کر دیا اور قول رسول قرآن کی آیت کے خلاف حجت اور موجب عمل رہا۔ (ص ۵۷)

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:-

اب اگر کہا جائے کہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ رسول کا کوئی قرآن کے خلاف ہوا اور رسول کا قول قرآن کو نسخ کر دے۔ تو پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ رسول کا قول اس کا اپنا قول نہیں ہوتا۔ وہ درحقیقت خدا کا قول ہوتا ہے۔ جس طرح قرآن خدا کا قول ہے اسی طرح رسول کا قول بھی خدا کا قول ہے۔ اور جس طرح قرآن کی ایک آیت قرآن کی دوسری آیت کو منسوخ کر دیتی ہے۔ اسی طرح خدا کا ایک قول (یعنی قول رسول) دوسرے قول (یعنی قرآن) کو منسوخ کر دیتا ہے۔ (ص ۵۸)

مہم نے یہ کہا تھا کہ ہمیں چاہیے کہ ہم قرن اول (عہد محمد رسول اللہ و الذین معہ) کی تاریخ کے ذخیرہ کو قرآن کی روشنی میں پرکھ لیں۔ جو باتیں قرآن کے مطابق ہوں انہیں صحیح تسلیم کر لیا جائے۔ جو اس کے خلاف ہوں انہیں مسترد کر دیا جائے۔ اس کے جواب میں حافظ ایوب صاحب نے فرمایا:-

**قرآن اور حدیث میں اختلاف ہو سکتا ہے** | جس طرح خدا کے قول کے حجت ہونے میں یہ شرط

نہیں کہ وہ عقل کے مطابق ہو۔ بالکل اسی طرح نبی کے قول کے حجت ہونے میں یہ شرط نہیں ہے کہ وہ قرآن کے مطابق ہو۔ اس لئے کہ نبی کا قول بھی قول اللہ ہے اور قرآن بھی قول اللہ ہے اور اللہ کے قول میں قرآن بھی اور حدیث رسول بھی۔ تو اللہ کے قول کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ اس میں تنوع نہ ہو۔ جس طرح کہ اس کے ایک فعل کے لئے ضروری نہیں ہے کہ وہ دوسرے فعل کے مطابق ہو۔ ایک لٹ پہاڑ کی چوٹی فلک تک پہنچ رہی ہے۔ دوسری طرف کھڑکی گہرائی تختہ الشریعہ تک پہنچ رہی ہے۔ جس طرح اس کے ایک فعل کا دوسرے فعل کے مطابق ہونا ضروری نہیں ہے۔ اسی طرح اس کے ایک قول کا (یعنی حدیث رسول کا) اس کے دوسرے قول (یعنی قرآن) کے مطابق ہونا

طبیعی کہ ہم نے شروع میں لکھا ہے، قرن اول کی تاریخ کا کچھ حصہ کتب احادیث میں ہے اور کچھ حصہ کتب سیر و آثار میں۔ کتب احادیث کو قرآن کے ہم پایہ بلکہ قرآن کا نسخہ ماننے والوں پر یہ بات بھی گراں گذرتی ہے کہ حدیث کو تاریخ کہہ دیا جائے۔ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ واقعہ خلافت اول کے متعلق بخاری کی جو احادیث سابقہ صفحات میں درج کی گئی ہیں وہ اگر تاریخی بیانات نہیں تو اور کیا ہیں۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ خود امام بخاری نے اپنی اس کتاب (مجموع احادیث) کا نام ”الجامع البصیر المسند المختصر من امور رسول اللہ و آیاتہ رکھا تھا (بحوالہ ”تدوین حدیث“ مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم) اس سے واضح ہے کہ خود امام بخاری کے نزدیک ان کی کتاب تاریخ کی کتاب تھی۔

ضروری نہیں ہے۔ (ص ۵)

(۱)

ایک حدیث ہے جس میں کہا گیا ہے۔

يَكْثُرُ ذِكْرُ الْأَحَادِيثِ مِنْ بَعْدِي. فَإِذَا رَوَى عَنِّي حَدِيثٌ فَأَعْرِضُوا  
عَلَى كِتَابِ اللَّهِ. خَمَاوَا ضَرَقَ فَأَقْبَلُوهُ. وَمَا خَالَفَ ضَرَقُوهُ.

(بحوالہ کتاب التوضیح والتلویح - ص ۱۸۱)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میرے بعد تم سے بہت سی احادیث بیان کی جائیں گی۔ سو جب کوئی حدیث میری طرف سے روایت کی جائے تو اسے کتاب اللہ کے سامنے پیش کرو جو اس کے موافق ہو اسے قبول کرو۔ جو اس کے خلاف ہو اسے رد کرو۔ اس حدیث کے صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ یہ قرآن کی تعلیم کے عین مطابق ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا کوئی ارشاد قرآن کے خلاف ہو نہیں سکتا۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ ان حضرات کی طرف سے اس کا کیا جواب ملا؟ جماعت اہل حدیث کے ترجمان اہنامہ، حقیق نے اپنی اپریل ۱۹۵۷ء کی اشاعت میں لکھا۔

اس حدیث کو ملحوظوں نے وضع کیا تھا  
اور انہی ملحوظوں کے خیالات کی خوشہ  
چینی بکواس ازم کے یہ ممبران کر رہے  
ہیں۔ امام خطابیؒ اس حدیث کے متعلق

**حدیث کو قرآن کے مطابق ہونا چاہیے**  
**یہ عقیدہ ملحوظوں کا ہے !**

فرماتے ہیں: وَصَحَّه الزَّيْنَادِيُّ السَّادِي مَقْصُودُهُمْ أَفْسَادُ الدِّينِ وَبِدْفَعِ  
قَوْلِهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنِّي أَوْتَيْتُ الْكِتَابَ وَمِثْلَهُ مَعَهُ.

(ظفر الانانی علی مختصر الجرجانی، ص ۲۶)

یعنی "یہ روایت ان زندلیقوں اور حدیث دشمنوں کی ٹوٹے ساختہ حدیث ہے جن کا مقصد احادیث کو رد کر دینے سے دینی نظام کا فاسد و باطل کر دینا ہے۔ اور اس حدیث کا بطلان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے خود مرہو جاتا ہے جس میں ارشاد ہے کہ میں قرآن دیا گیا ہوں اور قرآن کے مانند بھی دیا گیا ہوں۔ پس "حدیث" ہی قرآن کے مانند ہے۔ کیونکہ دوسری روایت میں تشریح ہے کہ "قرآن کے مانند" کا نام "حدیث" ہے۔ وہ روایت یہ ہے: لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَكَمُ  
مُسْتَكْنًا عَلَى أَرْبَعَةٍ يَصِلُ إِلَيْهِ عَنِ الْمَحْدِثِ فَيَقُولُ لَا نَجِدُ هَذَا الْحَكَمَ  
فِي الْقُرْآنِ إِلَّا هِيَ أَوْتَيْتُ الْقُرْآنَ وَمِثْلَهُ مَعَهُ. (ظفر الانانی ص ۲۶) دوسری  
حدیث کے الفاظ یہ ہیں: تَبَيَّنَ أَنَّ الرَّجُلَ مَتَّ كَمَا عَلِيَ أَرْبَعَتِ مَحْدَثِ مَحْدِثِ  
فَيَقُولُ بَيْنَمَا وَبَيْنَكُمْ كِتَابُ اللَّهِ أَحَدٌ بِيْشَ (دارمی ص ۱۸۱) جہاں اول طبع مصر اس  
قسم کی روایات الکفایہ (ص ۱۰۹) میں خطیبؒ نے ذکر کی ہیں جن میں صاف تصریح ہے کہ حدیث



کو رد نہ کرو۔ مجھے قرآن کی طرح اور اس کی مانند "حدیث" بھی دی گئی ہے۔ امام فطانی کی طرح امام شافعیؒ۔ امام المحدثین عبدالرحمن ابن مہدی وغیرہ نے بھی اس حدیث کو زندلیقوں کا وضع کردہ لکھا ہے۔ امام بیہقیؒ نے بھی فرمایا ہے کہ جو روایت سنت نبویہ کو قرآن پر پیش کرنے کی خاطر بنائی گئی ہے وہ باطل ہے۔ علامہ مہشیؒ نے لکھا ہے کہ اس میں ایک راوی متروک منکر الحدیث ہے۔ (مجمع الزوائد جلد اول ص ۶۵)

یعنی یہ مسلک کہ جو کچھ قرآن کے مطابق ہو اسے صحیح سمجھو۔ جو اس کے خلاف ہو اسے غلط قرار دو (ان حضرات کے نزدیک) محمد بن اور زنادقہ کا وضع کردہ ہے! خرد کا نام ہے جنہوں کو دیا، جنوں کا خرد جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

(۱)

گزشتہ اوراق میں جو اوراق ت آپ کی نظروں سے گزرے ہیں، ان سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آچکی ہے کہ ہماری کتب احادیث و سیر و آثار میں ایسی باتیں موجود ہیں جو (۱) قرآن کریم کی واضح تعلیم کے یکسر خلاف ہیں۔ (۲) جن سے نبی اکرمؐ کی ذات گرامی پر حرف آتا ہے۔ (۳) جن سے صحابہ کبارؓ کی سیرت و کردار مطعون ہو جاتے ہیں۔ (۴) جو علم و عقل کے بھی خلاف ہیں۔

اس کے بعد آپ کے دل میں لازماً یہ سوال ابھرے گا کہ

(ا) اس قسم کی باتیں ان کتابوں میں آ کیسے گئیں؟

یہ کیسے ہوا | (ب) ہزار برس سے یہ متواتر آگے منتقل کیسے ہوئی رہیں۔ یعنی لوگوں نے اس قسم

کی باتوں کو ان کتابوں سے خارج کیوں نہ کر دیا؟ اور

(ج) آج بھی ہمارا قدامت پرست طبقہ ان باتوں کو صحیح ماننے اور صحیح منوانے پر اس قدر

مصر کیوں ہے؟ اور

یہ سوالات ہر اس شخص کے دل میں پیدا ہونے چاہئیں جو ذرا بھی عقل و بصیرت سے کام لے اور ان امور پر غور و فکر کرے۔ جہاں تک پہلی دو شقوں کا تعلق ہے (یعنی اس قسم کی باتیں ہمارے لٹریچر میں آ کیسے گئیں؟ اور قوم نے انہیں ان کتابوں سے خارج کیوں نہ کر دیا؟) اس کے متعلق تفصیلی بحث کی ضرورت ہے اور اس کے لئے مناسب موقع وہ ہے جب ہم اپنی پوری تاریخ کا اندسر لے جائزہ لیں اور اس کے ایک ایک گوشے کے متعلق ریسرچ کریں۔ ظاہر ہے کہ ایک مقالہ میں اس کی گنجائش نہیں ہو سکتی ہم سر دست صرف اس نکتہ کو پیش کریں گے کہ آج بھی اس قسم کی باتوں کو صحیح ماننے اور صحیح منوانے پر اس قدر دیر کیوں دیا جا رہا ہے؟ اس نقطہ کی وضاحت ایک واقعہ سے ہو جائے گی۔ اسے غور سے سنیں۔

۱۹۵۸ء کی بات ہے کہ (کالعدم) جماعت اسلامی کے ارباب بست و کشاد کا ایک حلقہ ..... جماعت سے الگ ہو گیا۔ ان الگ ہونے والے حضرات نے اپنی علیحدگی کی وجوہات میں ایک طبری و عہد یہ بتائی تھی کہ جماعت کے دعوتی اور اشاعتی دور میں جن اصول کو دین کی محکمہ اساس کے طور پر پیش کیا جاتا تھا، نظام کے عملی قیام کے وقت ان سے انحراف کیا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اعتراض بڑا دقیقہ اور یہ جرم بڑا سنگین تھا۔ لیکن مرحوم (مودودی صاحب نے اس کے جواب میں کہا کہ میں نے یہ کونسا الٹا کھاکام کیا ہے۔ ایسا معاذ اللہ رسول اللہ نے بھی کیا تھا!)

یعنی اس کے عملی قیام کے وقت ان میں لچک پیدا کر لی تھی۔ مثلاً اسلامی نظام کے اصولوں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ تمام نسلی اور قبائلی امتیازات کو ختم کر کے اس برادری میں شامل ہونے والے سب لوگوں کو یکساں حقوق دیئے جائیں اور تقویٰ کے سوا فرق مراتب کی کوئی بنیاد نہ رہنے دی جائے۔ اس چیز کو قرآن مجید میں بھی پیش کیا گیا اور حضور نے بھی بار بار اس کو نہ صرف زبان مبارک سے بیان فرمایا بلکہ عملاً موالی اور غلام آزادوں کو امارت کے مناصب دے کر واقعی مساوات قائم کرنے کی کوشش بھی فرمائی۔ لیکن جب پوری مملکت کی فرمانروائی کا مسئلہ سامنے آیا تو آپ نے ہدایت دی کہ الائمة من قبلش امام قریش میں سے ہوں۔

ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اس خاص مسئلہ میں یہ ہدایت مساوات کے اس عام اصول کے خلاف پڑتی ہے جو کلیہ کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس وضعی روایت سے جو ہماری کتب تاریخ میں درج ہے (اور جس کا ذکر پہلے آچکا ہے) مودودی (مرحوم) نے کس طرح نمائندہ اٹھایا۔ ظاہر ہے کہ اگر معاملہ صرف قرآن تک رہتا اور دین میں اسی کو سند مانا جاتا تو مرحوم کو اپنی روش کی تائید میں کوئی دلیل و سند نہ مل سکتی۔ لیکن چونکہ تاریخ کو (قرآن کے برابر بلکہ اس سے بھی افضل) سند مان لیا گیا ہے اور اس میں ہر قسم کا رطب و یابس مسالہ موجود ہے۔ اس لئے اس سے ہر شخص کو اس کے ہر فیصلے اور عمل کی سند مل سکتی ہے۔ جماعت سے الگ ہونے والوں نے اس کے جواب میں کہا:-

غور فرمائیے۔ اگر یہ طریق کار خدا کے آخری نبیؐ نے اختیار فرمایا تھا۔ اور اگر اسلامی تحریک اس اسوۂ حسنہ کے مطابق اس طریق کار کو اپنا معمول بناتی ہے اور ہر کوئی ایسی عبادت جو اخلاص دین کی علمبردار ہودہ اس اصول کو بطور فلسفہ اور عقیدہ کے طے کر لیتی ہے کہ

ان تفصیل کے لئے المنبر لائل پورہ بابت ۳۱ جنوری ۱۹۵۸ء اور طلوع اسلام بابت مارچ و جولائی ۱۹۵۸ء ملاحظہ فرمائیے۔

اسلامی نظام کے دعوئی اور اشاعتی دور میں جو اصول بیان کئے جائیں اور جن پر لوگوں کو جمع کیا جائے۔ جب اسلامی نظام کو عملاً قائم کرنے کا وقت آئے گا تو اس تحریک کے قائد کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ توحید و رسالت ایسے اساسی اصولوں کے علاوہ، تحریک کے مفاد کے لئے جس اصول میں ضروری خیال کرے اسے استثناء پیدا کرے، اس پر عمل کرنے سے اپنی جماعت کو روک دے۔ جو نہایت اس تحریک کے عوام کو اپنے ابتدائی دور میں دی ہو اس میں سے جس جز کو وہ دین کی مصلحت کے لئے مضر خیال کرے ساقط کر دے (جیسا کہ مہینہ مثال میں حضور نے مساوات اور حق خلافت ایسے اصول اور ضمانت پر صحابہؓ کو عمل کرنے سے روک دیا تھا) تو اس اسلامی تحریک اور اقامت دین کی جدوجہد اور ان طالع آزمایا سیاست دانوں کی تحریکات کے مابین کیا فرق باقی رہ جائے گا جو حصول اقتدار سے پہلے نہایت پاکیزہ اصول بیان کرتے ہیں۔ بہت حسین وعدے عوام سے کرتے ہیں اور انہی اصولوں اور وعدوں کی بنیاد پر وہ لوگوں کی حمایت و تائید حاصل کر لے ہیں۔ جب انہیں اقتدار حاصل ہو جاتا ہے تو وہ اقتدار کو قائم رکھنے کی عمل مشکلات سے مجبور ہو کر ان وعدوں اور اصولوں کی خلاف ورزی پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

**جھوٹ بولنا بھی جائز ہے** | اس پر مردودی (مرحوم) ایک قدم اور آگے بڑھے اور فرمایا کہ اقامت دین جیسے اہم مقصد کے حصول کے لئے اصولوں میں یکساں اور استثنائے تو ایک طرف ان کے لئے جھوٹ بولنا بھی نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہو جاتا ہے۔ انہوں نے کہا:-

باستبازی اور صداقت شعاری اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے اور جھوٹ اس کی نگاہ میں ایک بدترین برائی ہے۔ لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض حالات میں اس کے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے۔  
(ترجمان القرآن - مئی ۱۹۵۷ء)

آپ حیران ہوں گے کہ مرحوم نے ایسا کہنے کی جرأت کیسے کر لی اور اس کی تائید میں ان کے پاس کون سی سند ہو سکتی تھی؟ لیکن جس تاریخ سے انہوں نے پہلی سند پیش کی تھی اسی سے انہیں اس کی سند بھی مل گئی۔ چنانچہ انہوں نے "جھوٹ کے وجوب" میں دوہیں

**حدیث سے اس کا ثبوت** | حدیثیں نقل کر دیں۔ جن میں سے ایک یہ تھی کہ

اسما بنت یزید نبی اکرمؐ سے روایت کرتی ہیں کہ جھوٹ جائز نہیں ہے۔ مگر تین چیزوں میں مرد کی بات عورت سے تاکہ وہ اسے راضی کرے۔ جنگ اور اصلاح بین الناس۔ (ترمذی)

اس کے بعد انہوں نے (بمعاذ اللہ) نبی اکرمؐ کے اسوہ حسنہ سے بھی اس کی مثالیں پیش کر دیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:-



اس کی عمل مثالیں بھی احادیث میں موجود ہیں۔ کعب بن اشرف کے قتل کے لئے محمد بن مسلم کو جب حضورؐ نے مامور کیا تو انہوں نے اجازت مانگی کہ اگر کچھ جھوٹ نونا پڑے تو بول سکتا ہوں، حضورؐ نے بالفاظ صریح انہیں اس کی اجازت دی۔ (بخاری)

امید ہے کہ اس سے یہ بات آپ کی سمجھ میں آگئی ہوگی کہ یہ حضرات تاریخ اور روایات کے اس قسم کے بیانات اور واقعات کو (جن کا خلاف قرآن اور غلط ہونا بدیہات میں سے ہے) سچا اور دین میں سند تسلیم کرانے پر کیوں زور دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ (جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے) اگر سند قرآن ہے اور اس اصول کو تسلیم کر لیا جائے کہ قرآن اقل کی تاریخ کا جو بیان قرآن کے خلاف ہے وہ غلط ہے، تو کسی کو اپنی قریب کا دیوں اور کذب تراشیوں کے لئے دینی سند نہیں مل سکتی۔ ایسا اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب اس قسم کے تاریخی بیانات کو دین میں سند تسلیم کر لیا جائے۔ اور پھر انہیں اپنے فیصلوں کی تائید میں پیش کر دیا جائے۔ اس سے ہمارا مطلب یہ نہیں کہ اس طبقہ کے تمام افراد اسی جذبہ کے تحت ان باتوں کو صحیح مانتے اور صحیح مانتے ہیں۔ ان میں بشر حصہ ان افراد پر مشتمل ہے جو ان باتوں کو نیکیت سے سچا مانتا ہے۔ یہ اس لئے کہ صدیوں کی تقلید سے ان میں سمجھنے اور سوچنے کی صلاحیت باقی نہیں رہی۔ ان کے نزدیک دین کے معاملات میں غور و فکر سے کام لینا جائز نہیں۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ جو کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے، وہی صحیح ہے اس پر کسی قسم کی تنقید نہیں کی جا سکتی۔ یہ حضرات اس تاریخ کی حفاظت و ترویج کو عین دینی خدمت سمجھتے ہیں۔ مفاد پرست طبقہ اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ یہی وہ طبقہ ہے جس نے اس قسم کی باتیں وضع کر کے انہیں ابتداء ہماری تاریخ میں شامل کیا تھا۔ یہی اسے صدیوں سے مسلسل و متواتر آگے بڑھائے چلا آ رہا ہے اور یہی آج اس کے تحفظ کا سب سے بڑا علمبردار بن کر سامنے آتا ہے۔ اس کی ایک مثال سنئے۔ ہم شروع میں بتا چکے ہیں کہ قرآن نے جس نظام کو اولین کہا ہے اہل

## اسلام اور نظام سرمایہ داری

میں فاضلہ دولت کسی کے پاس جمع نہیں رہتی۔ وہ نوع انسانی کی بہبود کے لئے اُمت (یا نظام) کی تحویل میں چل جاتی ہے۔ اس باب میں قرآن کی تعلیم ایسی واضح، بقی اور صاف ہے کہ اس میں کسی قسم کی تاویل و تفسیر کی گنجائش نہیں۔ ظاہر ہے کہ عہد محمد رسول اللہ والذین معہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین) میں قرآن کی اسی تعلیم پر عمل ہوتا رہا۔ لیکن اس کے بعد جب خلافت مہرکیت میں بدل گئی اور سرمایہ دارانہ نظام مہموم کر کے آگیا تو اس کی ضرورت پڑی کہ اس کی تائید اور جواز کے لئے سندیں وضع کی جائیں۔ یہ اسناد قرآن سے تو مل نہیں سکتی تھیں کیونکہ اس میں تغیر و تبدل اور حکم و اضافہ کی گنجائش نہیں تھی۔ اس کے لئے تاریخ کا چور دروازہ ہی کام دے سکتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس سے کام لیا اور اس قسم کی روایات وضع کیں جن سے نظام سرمایہ داری، زمینداری اور جاگیرداری کا نظام عین مطابق سنت رسول اللہ و سنت صحابہ قرار پا جائے۔ مثلاً ایک روایت میں ہے۔۔۔

## مشکوٰۃ کی ایک حدیث

ابو عباسؒ کہتے ہیں کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔۔۔

وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يَنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُمْ  
بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (۹۳) جو لوگ سونے اور چاندی کو جمع کرتے ہیں اور اسے خدا کی راہ  
میں کھلا نہیں رکھتے۔ اسے رسولؐ تو انہیں دردناک عذاب سے آگاہ کر دے گا تو مسلمانوں پر  
اس کا خاص اثر ہوا یعنی انہوں نے اس حکم کو گراں خیال کیا۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں سے کہا  
کہ میں تمہاری اس فکر کو دور کر دوں گا۔ اور اس مشکل کو حل کروں گا۔ پس عمرؓ رسول اللہؐ  
اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا، یا نبی اللہ یہ آیت آپؐ کے صحابہ پر گراں  
پڑی ہے۔ آپؐ نے فرمایا خداوند تعالیٰ نے زکوٰۃ اس لئے فرض کی ہے کہ وہ تمہارے باقی مال کو  
پاک کر دے اور میراث کو اس لئے فرض کیا ہے کہ جو لوگ تمہارے بعد رہ جائیں ان کو مال مل جاتا۔  
ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ کا یہ بیان سن کر عمرؓ نے جوش مسرت سے اللہ اکبر کہا۔ اس  
کے بعد حضورؐ نے فرمایا کہ میں تم کو ایک ایسی بہترین چیز کا پتہ دوں جس کو انسان جمع کر کے خوش  
ہو اور وہ چیز نیک بخت عورت ہے۔ اس کی طرف مرد دیکھے تو اس کا دل خوش ہو اور جب مرد  
اس کو کوئی حکم دے تو وہ اس کی اطاعت کرے اور جب وہ غائب ہو تو اس کے مال و دولت  
کی حفاظت کرے۔ (ابوداؤد) (مشکوٰۃ جلد اول - اردو ترجمہ صفحہ ۳۱)

یہ روایت زبان حال سے پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ یہ وضع کردہ ہے۔ یہ کبھی تصدیر میں بھی نہیں آسکتا ہے کہ  
خدا کا ایک حکم ہو اور صحابہؓ پر وہ گراں گذرے؟ پھر ان میں سے (کوئی اور بھی نہیں) حضرت  
عمرؓ اس حکم کو بدلوانے کے لئے رسول اللہؐ کے پاس جائیں۔ اور رسول اللہؐ خدا کے اس  
حکم کو یوں بدل دیں کہ اگر تم اڑھائی فی صد سالانہ ادا کرو تو تمہیں اجازت ہے کہ سونے چاندی  
کے ڈھیر جمع کرتے رہو۔ روایت کا انداز بتا رہا ہے کہ یہ بعد کے دور کی وضع کردہ ہے۔ لیکن چونکہ  
اس سے سرمایہ دارانہ نظام کا تحفظ ہوتا ہے اس لئے مفاد پرست گروہ اسے صحیح ترین حدیث قرار  
دے کر برابر آگے بڑھائے لارہا ہے۔ اسی قسم کی روایات ہیں جو آج بھی سرمایہ داری۔ زمینداری  
اور جاگیرداری کی تائید میں بڑھ چڑھ کر پیش کی جاتی ہیں۔ اور جب کوئی یہ کہے کہ یہ چیزیں قرآن سے  
خلاف ہیں تو اسے یہ کہہ کر چپ کر دیا جاتا ہے کہ تم قرآن کو زیادہ سمجھتے ہو یا رسول اللہؐ اور صحابہؓ  
کیا زیادہ سمجھتے تھے!

(۰)

چونکہ اس مقالہ میں پوری تاریخ کا استقصاء مقصود نہیں اس لئے ہم انہی مثالوں پر ہی  
اکتفا کرتے ہیں۔ آپ ان واقعات کو پھر سے سامنے لاسیے جو خلیفہ اول کے انتخاب کے ضمن میں  
ہماری کتب احادیث و آثار میں بیان ہوئے ہیں اور پھر سوچئے کہ اگر اس تاریخ کو صحیح تسلیم کر  
لیا جائے تو دنیا میں اسلام اور متبعین اسلام کی پوزیشن کیا رہ جاتی ہے؟

سوال یہ ہے کہ ان حالات میں کیا کیا جائے؟ اس کا جواب  
پس چہ بایدر کرد؟ | آسان ہے یعنی۔

(۱) ہمارا ایمان ہے کہ قرآن کریم خدا کی کتاب ہے جو حرفاً حرفاً اپنی حقیقی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔

(۲) رسول اللہ اور آپ کے صحابہ کبارؓ کی زندگی قرآن کے مطابق تھی۔ لہذا

(۳) اگر اس دور کی تاریخ میں ہمیں کوئی بات ایسی ملے جو قرآنی تعلیم کے خلاف ہے تو ہمیں بلا تامل کہہ دینا چاہیے کہ تاریخ کا وہ بیان غلط ہے۔ خواہ وہ حدیث کے کسی مجموعہ میں ہو، یا کسی اور کتاب میں۔

(۴) مندرجہ بالا اصول کی روشنی میں ہمیں قرنِ اول کی تاریخ کو از سر نو مرتب کرنا چاہیے۔ اس تاریخ سے یہ معلوم ہو سکے گا کہ اس دور میں قرآن کریم پر اس طرح عمل ہوا تھا۔

(۵) اس دور کے ہر قرآنی نظام باقی نہیں رہا تھا، اس لئے اس وقت سے آج تک کی تاریخ مسلمان قوم کی تاریخ ہے۔ یہ تاریخ نہ اسلام کی صحیح تعبیر کہلا سکتی ہے، نہ ہمارے لئے دلیل اور حجت بن سکتی۔ نہ ہی ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم ان لوگوں کی مدافعت میں اپنا وقت اور توانائیاں صرف کریں۔ جنہیں اسلاف کہا جاتا ہے ان کے متعلق ہم اس سے زیادہ ماننے کے مکلف نہیں کہ

يُنَالِكُمْ اُمَّةٌ قَدِ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَرَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا  
تَسْمَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۱۱۱)

یہ وہ لوگ ہیں جو گزر چکے ہیں۔ انہوں نے جو کچھ کیا اس کا نتیجہ ان کے لئے تھا۔ تم جو کچھ کرو گے اس کا نتیجہ تمہارے لئے ہوگا۔ تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ انہوں نے کیا کیا تھا؟

(۶) جہاں تک قرآن کریم کے سمجھنے کا تعلق ہے اسے ہر زمانہ میں براہِ راست سمجھا جاسکتا ہے۔ دین میں سند اور حجت قرآن ہے۔ اور یہی ہمارے لئے غلط اور صحیح۔ حق اور باطل کا معیار ہے۔ جو اس کے مطابق ہے وہ حق ہے جو اس کے خلاف ہے وہ باطل ہے۔

جب تک ہم اس منک پر غل پیرا نہیں ہوتے، دین ہمارے سامنے نہیں آسکتا۔

(۷)۔

یہ مقالہ آج سے قریب بائیس سال پہلے کا نوشتہ ہے۔ اسے اس موقع پر  
تکرار دوبارہ شائع کرنے کا ایک خاص مقصد ہے۔ آج کل ہمارے ہاں "اسلامی نظام" کا خاص چرچا ہے اور اس موضوع پر بڑی کثرت سے لکھا اور کہا جا رہا ہے۔ ان میں سے ہر محقق کی تان اس پر ٹوٹتی ہے کہ اسلامی نظام کا جو نقشہ صدرِ اقل میں قائم ہوا تھا، ہمیں اسی قسم کا نظام اپنے ہاں قائم کرنا چاہیے۔ اس کے لئے ہر ایک، اپنے اپنے نقشہ کی تائید میں تاریخی شواہد



پیش کرتا ہے، اور چونکہ ان نقوشوں میں باہمی اختلاف ہوتا ہے اس لئے ملک میں عجیب قسم کا ذہنی انتشار پیدا ہو رہا ہے۔ اندریں حالات ہم نے مناسب سمجھا کہ صدرِ اول کی جو تاریخ ہم تک پہنچی ہے اس کی ایک حقیقت سی جھٹاک قوم کے سامنے لائی جائے تاکہ اسے اندازہ ہو جائے کہ روایات کی طرح تاریخ بھی یقینی ذریعہ علم نہیں۔

یاد رکھئے! دین کے متعلق یقینی اور معنی بر حقیقت علم، خدا کی کتاب (قرآن مجید) کے اندر محفوظ ہے جس میں ایک حرف کا بھی تغیر و تبدل نہیں ہوا۔ اس لئے وہی نظریہ، عقیدہ، مسلک قانون یا نظام اسلامی کہلا سکتا ہے جس کی سند قرآن سے حاصل ہو۔

حق وہی ہے جو قرآن کے مطابق ہے۔ جو اس کے خلاف ہے وہ باطل ہے خواہ اس کی نسبت کسی کی طرف کیوں نہ کر دی جائے۔ اس مقالہ میں بھی جو تاریخی بیانات قرآن کے خلاف ہیں، انہیں ہم وضعی قرار دیتے ہیں۔

(۰)

## پرویز صا کی شہرِ افاق کتابیں جن سے صحیح اسلام سمجھ سکتا ہے

### لغات القرآن

یہ قرآنی الفاظ کی صرف لکھنوی نہیں، یہ ان کا مستند اور جامع مفہوم پیش کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان الفاظ سے قرآن کریم کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے اس کی تعلیم کیا ہے، اس کی دعوت کیا ہے، قرآن مجید نے انسان کو کیا دیا ہے۔ یہ اس کا کیا مقام بتاتی ہے چار جلدوں کی یہ کتاب قرآنی حقائق اور علوم حاضرہ کا انسائیکلو پیڈیا ہے خوبصورت ٹائپ میں عمدہ سفید کاغذ پر چھپی ہے۔ قیمت: ہر فی جلد ۲۰/- روپے مکمل سیٹ ۱۵۰/- روپے

### مفہوم القرآن

قرآن مجید مروجہ ترجموں اور عام تفسیروں سے سمجھیں نہیں آسکتا، یہ اس طرح سمجھیں آسکتا ہے کہ عربی مبہین کی مستند کتب لغت کی روش سے اس کے الفاظ کے معانی متعین کئے جائیں اور ایک مضمون سے متعلق مختلف آیات کو سامنے رکھ کر اس کا مفہوم مرتب کیا جائے۔ مفہوم قرآن پرویز صا نے پورے قرآن کا مفہوم اسی انداز سے مرتب کیا ہے جو مفہوم القرآن کے نام سے دس متن اعمدہ دبیر کاغذ پر تین مطلق جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔ قیمت: ہر فی جلد ۵۰/- روپے مکمل سیٹ ۱۵۰/- روپے

ملنے کا پتہ

(۱) ادارہ طلوع اسلام بی ۵ گلبرگ لاہور (۲) مکتبہ دین و دہاں چوک اردو بازار لاہور